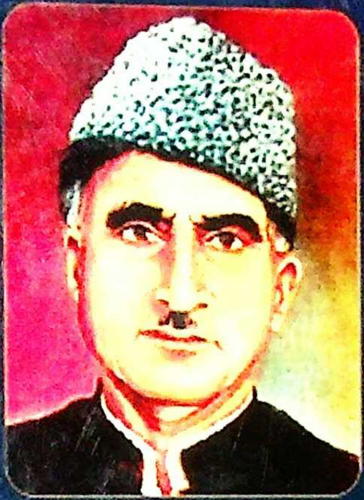
ہر فن مولا



پروفیسر محی الدین حاجنی

(تاریخی، علمی و تحقیقی مطالعہ)

شاکر شفیع

ہر فن مولا

پروفیسر محی الدین حاجنی

(تاریخی، علمی و تحقیقی مطالعہ)

شاکر شفیع

ISBN-973-93-30691-44-2

عنوان :۔	ہرفن مولا پروفیسر محی الدین حاجنی (تاریخی، علمی و تحقیقی مطالعہ)
مصنف :۔	شاکر شفیع
سال اِشاعت :۔	۲۰۱۹
کمپوزنگ :۔	نذہت خان
قیمت :۔	تین سو پچاس روپیہ
سرورق :۔	سید مدثر
زیراہتمام :۔	کشمیر بک پرموشن ٹرسٹ
ناشر :۔	میزان پبلشرز بٹہ مالو سرینگر

9419002212,8494002212,7006773404

انتساب

اپنے والدین کے نام

اللھم رب رحمھما کما ربّیانی صغیرا

فہرست مضامین

۱۔ فصلِ اول
حالاتِ زندگی ۱۱
۱۔ زندگی کا سفر ۱۲
۲۔ فصل دوم
محقق ونقاد حاجنیؔ ۳۶
۲۔ کتاب الطواسین کے شارح پروفیسر حاجنیؔ ۳۹
۳۔ پروفیسر حاجنیؔ کے وہابؔ ۴۸
۴۔ کلامِ دیگرے ۶۸
(الف) مولوی صدیق اللہ حاجنیؔ ۶۹
(ب) کشمیری زبان کے نثری لوک ادب کا خاکہ ۷۶
(ج) علامہ اقبال اور حلاج ۸۲
(د) آگ اور مرزا عارف کی ایک رباعی ۹۰
۳۔ فصلِ سوم
تخلیق کار حاجنیؔ ۹۳
۵۔ پروفیسر حاجنیؔ کی انشائیہ نگاری ۹۴
۶۔ پروفیسر حاجنیؔ اور اردو صحافت ۹۹
۷۔ پروفیسر محی الدین حاجنیؔ ایک مکتوب نگار ۱۱۲
۸۔ جو ہم سمجھے ۱۲۶

چند تاثرات

محی الدین حاجنیؔ علمی تبحر، خودداری، صاف گوئی، بے باکی، بے نیازی، کشمیرنوازی اور دیگر گوناں گوں اوصافِ جمیلہ کی وجہ ریاست جموں وکشمیر کے معاصر ادبی، علمی اور تہذیبی منظر نامے کی قابلِ رشک علامت بن چکے ہیں۔ وہ ایک ایسے مردِ قلندر تھے جو حق پرستی اور بااصول طرزِ عمل سے ملنے والے مصائب اور مشکلات کو سمجھوتوں کے مراعات سے بہتر پُرلطف اور آرام دہ سمجھتے تھے۔ مغربی علوم اور انگریزی زبان کے ممتاز ماہر ہونے کے باوجود مشرقی طرزِ تمدُن کے پاسدار رہے۔ اعلیٰ عہدوں کی پیشکش کو ٹھکرا کر زندانوں میں رہنے کو ترجیح دی۔ شاید اُس کے ہمعصر ادباء، شعراء اور قلمکاروں میں ایسا اور کوئی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے اُس دور سے وابستہ ادیبوں، شاعروں اور استادوں میں جس شخص کو سب سے زیادہ یاد کیا جاتا ہے وہ محی الدین حاجنیؔ ہی ہے۔

محی الدین حاجنیؔ صاحب ۱۹۹۳ کے پُر آشوب حالات میں رحمتِ حق ہوئے اور جب سے آج تک اُن کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔ کئی کتابوں کے علاوہ رسائل اور جرائد کے خصوصی حاجنیؔ نمبرات چھپ گئے۔ اس اعتبار سے عزیزم شاکر شفیع کی درِدست تصنیف کوئی اولین کوشش نہ ہونے کی وجہ سے مصنف کے لئے ایک چلینج والا کام ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے والے قارئین میں ہر کسی کا یہ تقاضا ہوگا کہ اسمیں کوئی ایسی نئی بات

ہونی چاہئے جو محی الدین حاجنیؔ کے بارے میں اس سے قبل چھپی ہوئی کتابوں اور رسالوں میں دستیاب نہ ہوں۔ میں نے اس کتابچہ کے مسودے کا غور سے مطالعہ کر کے یہ بات اخذ کی کہ اس تصنیف میں مصنف نے حاجنیؔ کی شخصیت کو مقامی روایات اور ماحول کے تناظر میں نہ صرف باریک بینی سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس میں ایک ایسا Personal Touch پڑھنے کے دوران محسوس ہوتا ہے جو اس سے پہلے لکھے گئے لٹریچر میں اس قدر موجود نہیں ہے۔ حاجنیؔ شناسی کے لئے حاجن شناس اس اعتبار سے ضروری ہے کیونکہ حاجنیؔ صاحب اپنی علمی اور ادبی اور علمی زندگی کا بیشتر وقت وہاب پرے، اسد پرے، مولوی صدیق اللہ کی تخلیقات کو جمع کرنے اور اُنہیں ایڈٹ کرنے اور شائع کرا کے منظرِ عام پر لانے میں صَرف کیا ہے۔ حلقہ ادب سوناواری حاجن اور ادبی مرکز کمراز کے بانی بھی محی الدین حاجنیؔ ہی تھے۔ اِن دونوں ادبی تنظیموں اور اِدارۂ اوقات اسلامیہ حاجن کے ساتھ وابستہ رہ کر جو کام اور کارنامے کشمیر کی اس تمدن ساز شخصیت نے انجام دئے ہیں اُن کے زندۂ جاوید گواہ نہ صرف باشندگانِ حاجن بلکہ اس علاقے کے اکثر در و دیوار بھی ہیں۔ نوجوان ادیب، محقق اور سکالر شاکر شفیع نے حاجنیؔ صاحب کی شخصیت اور علمی کاوشوں کو مقامی ماحول کے پسِ منظر اور نفسیاتی عوامل کے ساتھ جوڑ کر اپنے مطالعے کو سائینسی طریقے پر پیش کیا ہے۔ میں اس جواں سال قلمکار کی صلاحیتوں کے حق میں ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ ان کی یہ تصنیف علمی اور ادبی حلقوں سے دادِ تحسین حاصل کرے گی۔

اخلاص مند

عزیز حاجنیؔ

اپنی بات

ادیب ایک حساس سماجی فرد ہوتا ہے اور ادب کا بہت ہی اہم سماجی سروکار۔ ایک عرصہ سے یہ بحث چلی آ رہی ہے کہ ادب اور سماج کا کیا رشتہ ہے۔ مفکرِ اول افلاطون نے تو ادیب کو سماج سے بے دخل ہی کر دیا تھا۔ لیکن جب اُس کے افکار و خیالات کے ساتھ اُس کے شاگرد ارسطو نے ہی اتفاق نہ کیا، دوسرے لوگ کیونکر کرتے۔ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور ادیب نہایت ہی حساس اور ذہین آئینہ ساز۔ ہر جینیون تخلیق کار اپنے ملک وقوم کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ ایک حساس سماجی رکن ہونے کی حیثیت سے ادیب کئی بار سماجی خیالات اور اجتماعی فکری دھاروں کو رخ بدل کر اُن کو نئی سمت عطا کرتا ہے۔ حالانکہ یہ بات بھی طے ہے کہ اچھا تخلیق کار کوئی مبلغ یا واعظ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ وہ غیر محسوس طریقے سے انقلاب یا تغیر کیلئے زمین ہموار کرتا ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی پچاس سال دنیا کیلئے کئی معنوں میں ہنگامہ خیز اور صبر آزما تھے۔ مثبت پہلو دیکھے جائے تو صنعتی انقلاب نے پر پھیلا کر ترقی پذیر ممالک میں اپنی جگہ بنالی اور ان ممالک اور تیسری دُنیا کے غریب اور بدحال لوگوں کیلئے امید کی کرن جگا دی۔ سائنس کی نت نئی ایجادات انسانی زندگی کے بقاء کیلئے نئے نئے سامان میسر کر رہی تھیں۔ لیکن اس صدی میں انسان نے عالمِ انسانیت کی تباہی کے سارے سامان بھی تیار کر لئے۔ جن کا کھلم

کھلا مظاہرہ دو عالمی جنگوں میں کیا گیا۔ ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کے حصول کی ایک بے ہنگم دوڑ بھی ان ہی سالوں میں شروع ہوئی اور آج تک پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔

ان سالوں میں ہندوستان کے حالات بھی دگرگوں تھے۔ سیاسی اور سماجی انتشار کی وجہ سے ہندوستان کا قومی وجود ہچکولے کھا رہا تھا۔ انگریزوں کے جابرانہ استبداد کے خلاف پورا ملک برسر پیکار تھا۔ غریب اور عام لوگ کئی ظلموں میں پھنسے ہوئے تھے۔ ایک طرف سے برطانوی سامراج کے مظالم اپنے عروج پر تھے دوسری طرف سے سرمایہ دار اور جاگیردار خون چوس رہے تھے۔ انتہا پسند اور اعتدال پسند آزادی نوازوں کے درمیان بھی ٹکر تھی۔ مسلمان ہندوستان میں اپنے آپ کو اور اپنی قومی بقاء کو غیر محفوظ تصور کر رہے تھے۔ اس لئے مسلم لیگ ایک نئے ملک کے خواب بُن رہی تھی۔ ایسے میں ادیب بھی ان سیاسی اور سماجی حالات سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکے۔ جہاں غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کو اپنے حقوق دلانے کے لئے ترقی پسندی کے نام اشتراکی خیالات ادب اور ادیبوں کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے۔ وہی انگریزوں کے ظلم کے خلاف بھی ادیب قلمی جنگ لڑ رہے تھے۔

ریاستِ جموں وکشمیر کے لئے بھی یہ زمانہ امن وآشتی اور خوشحالی کا زمانہ نہیں تھا۔ پوری ریاست سیاسی، سماجی، ثقافتی، معاشی اور لسانی محاذ پر غیر یقینی صورتحال سے دوچار تھی۔ شخصی راج کا بدترین چہرہ ڈوگرہ شاہی کے روپ میں کشمیریوں کی کمر توڑ رہا تھا۔ لوگ طرح طرح کے مصائب ومشکلات سے دوچار تھے۔ اظہارِ رائے پر قدغن تھی۔ ادیبوں اور تخلیق کاروں کے خیالات پر پہرہ تھا۔ ان ہی صبر شکن حالات میں کشمیر کے عظیم محقق اور دانشور، کشمیری لسانی تحریک کے علمبردار محی الدین حاجنیؔ پیدا ہوئے اور اپنی جوانی کو پہنچے۔ یعنی جب پوری دنیا ایک ہیجانی صورتحال اور مشکل حالات سے نکلنے کے لئے راستے تلاش رہی تھی، محی الدین اپنے لڑکپن سے جوانی کے سفر کی اور رواں دواں تھے۔ وہ دنیا کے حالات کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے۔ ان بدلتے سیاسی اور سماجی حالات کے تناظر میں وہ اپنے تشخص اور پہچان

کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اپنی جوانی میں ہی وہ مشرقی علوم اور فلسفہ کے نباض بن گئے۔ فارسی ادب اور فلسفے پر اپنی گرفت مظبوط کرلی۔ عربی زبان وادب کے وہ طالب علم تھے۔ اردو زبان کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا۔ انگریزی اور سائنسی علوم سے بخوبی آشنائی کی۔ ان سبھی امور نے ایک ایسے محی الدین کو جنم دیا جو کشمیر اور کشمیریوں کے تشخص کے متعلق سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ غور وفکر کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ زبان بھی کسی قوم کے اجتماعی شعور کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تمدن کی بھی ضامن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محی الدین حاجنیؔ نے کشمیری تشخص کی بقاء کے لئے کشمیری زبان کی بقاء کو ضروری سمجھا۔

پروفیسر محی الدین حاجنیؔ نے جو سمجھا، اُس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری زندگی کوشاں رہے۔ کشمیریوں کے تشخص کی بحالی اور بازیابی کے لئے انہوں نے کشمیری زبان کو ذریعۂ بنایا۔ وہ انفرادی اور اجتماعی، ہر سطح پر سچے اور کھرے کشمیری طرز کے انسان تھے۔ انہوں نے کشمیری لسانی تحریک کی بنیاد رکھی۔ شمالی کشمیر کی ادبی تنظیموں کے وفاق ''ادبی مرکز کمراز'' کو قائم کر کے انہوں نے اپنے وقت میں ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ اس وفاق نے ملک اور بیرونِ ملک رہنے والے کشمیری دانشوروں، مفکروں اور ادیبوں کو جوڑ کر ایک مکمل اور منظّم تحریک کی شکل اختیار کی۔ جن شخصیات نے اس ادبی اور تمدنی وفاق کے ساتھ جڑ کر کشمیری لسانی تحریک کو مربوط و منظّم کرنے میں محی الدین حاجنیؔ کے شانہ بہ شانہ کام کیا، اُن میں پروفیسر رشید نازکی، علی محمد شہباز، نشاط انصاری، منظور ہاشمی، محمد احسن احسنؔ، محمد امین شکیب، غلام محمد غمگین، سیفی سوپوری، عطیقہ بہن جی وغیرہ کے نام کافی اہم ہیں۔ یہ تحریک آج بھی اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ منزلِ مقصود کی اور رواں دواں ہے۔

پروفیسر حاجنیؔ ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز، ایک فکر انگیز قلم کار اور ایک دیدہ ور نثر نگار تھے۔ انہوں نے انگریزی میں بھی لکھا اور فارسی کو بھی وسیلۂ اظہار بنایا۔ وہ کشمیری میں جس آسانی کے ساتھ قلم اٹھا سکتے تھے اُسی آسانی کے ساتھ اردو میں بھی خامہ فرسائی کرتے تھے۔

البتہ ایک بات طے ہے کہ انہوں نے جس زبان میں بھی لکھا فقط اُن کے پیشِ نظر کشمیر اور کشمیروں کی زبوں حالی تھی۔ وہ کشمیری زبان وادب کو پنپتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے عمر بھر اسی کاز کے لئے لکھتے بھی رہے اور لڑتے بھی رہے۔ اُن کو کیا کچھ نہیں آتا تھا۔ وعظ و تبلیغ کرنے بیٹھتے تو لوگ اُن کی باتوں پر عش عش کرتے۔ فلسفیانہ گتھیاں سلجھاتے تو افلاطون و سقراط سے آنکھیں دوچار کرتے۔ تنظیم سازی میں اُن کا کوئی ثانی ہی نہ تھا اور فنِ تعمیر میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ وہ حقیقت میں "ہرفن مولا" تھے۔ اُن کے جیسا آج تک کشمیری زبان و ادب کا کوئی ہمدرد پیدا نہ ہوا۔

پروفیسر حاجنی نے اردو میں بہت لکھا۔ لیکن شومیِ قسمت یہ کہ اُن کے اردو مضامین کو کسی نے بھی آج تک کتابی شکل دینے کی کوشش نہیں کی۔ دوسرا المیہ یہ ہے کہ یہ مضامین اب دن بہ دن نایاب ہوتے جارہے ہیں۔ ان مضامین کے بارے میں مجھے سب سے پہلے پروفیسر قدوس جاوید نے جانکاری دی، ساتھ ہی مجھے آمادہ کیا کہ میں ان مضامین پر ایک مقالہ لکھوں۔ ان مضامین کو جمع کرنا کارِدارد تھا۔ لیکن مرحوم احسن صاحب کی ذاتی کوششوں سے میں ان کو جمع کرنے میں کامیاب ہوسکا۔

پروفیسر حاجنی کے اردو کارناموں پر اپنی رائے اور اپنے تاثرات قلمبند کرکے میں کوئی بہت بڑا علمی، تحقیقی یا تنقیدی کارنامہ انجام دینا نہیں چاہتا ہوں بلکہ میرا خالص مقصد یہ ہے کہ اہلِ علم و دانش اور ناقدین کی توجہ ان مضامین کی طرف بھی مبذول ہوجائے۔ میری اس طالبِ علمانہ سعی کا واحد مقصد یہی ہے کہ لوگ ان مضامین کو بھی نظرِ التفاف سے دیکھیں اور ان کا معیار مقرر کریں۔ میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا اندازہ ابھی لگانا مشکل ہے۔

اس سعیِ جمیل کے دوران کئی لوگوں نے میری مدد بھی کی اور رہنمائی بھی۔ ان شخصیات کا شکریہ ادا کرنا بہت ہی ضروری سمجھتا ہوں۔

سب سے پہلے پروفیسر قدوس جاوید صاحب کا شکریہ جنہوں نے مجھے اس کام کے لئے آمادہ کیا۔ اور مجھے لکھنے کی ترغیب دی۔

استادِ محترم ڈاکٹر عزیز حاجنیؔ صاحب کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب کو چھاپنے کے لئے میری مجھے آمادہ کیا اور اس کتاب کے لئے چند کلمات عنایت فرما کر میرا حوصلہ بھی بڑھایا۔

اپنے دوست ڈاکٹر امین فیاضی کا شکریہ کرنا ضروری ہے، جنہوں نے مجھے اس کتاب کی تیاری کے دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک مہینہ برداشت بھی کیا اور میری مدد بھی کی۔

میزان پبلیشرز کے مالک شبیر صاحب کا بھی مشکور ہوں، جنہوں نے مجھ پر بھروسہ کر کے اس کتاب کو چھاپا۔

میرے گھر والوں کا شکریہ، جو مجھ سے بہت زیادہ تقاضے نہیں کرتے ہیں۔

آخر پر لیکن سب سے زیادہ دعا اُن کے لئے جو اب ہمارے درمیاں نہیں ہے لیکن پھر بھی ہمارے لئے باعثِ حوصلہ و ولولہ ہے۔ جن کا مرقد ہمارے لئے امیدوں اور آستھاؤں کا مرکز ہے۔ جنہوں نے قدم قدم پر میری رہبری فرمائی۔ اللہ محمد احسن احسنؔ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ وہ نہ ہوتے تو شاید میں طالبِ علمی کے زمانے میں یہ کام انجام نہیں دے پاتا۔

اب یہ مختصر سی کتاب ہدیہ قارئین کرتا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ لوگ اس کو دیکھ کر پروفیسر محی الدین حاجنیؔ کو نئے سرے سے جاننے کی کوشش کریں گے۔ امید ہے کہ اس کی خامیوں کے بارے میں مجھے معاف اور مطلع فرمایا جائے گا۔

والسلام

شاکر شفیع

فصلِ اول

حالاتِ زندگی

پروفیسر محی الدین حاجنیؔ

زندگی کا سفر

کشمیر اپنے قدرتی مناظر کے لئے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہاں کے سرسبز وشاداب جنگل، فلک بوس برفیلی چوٹیاں، اونچے اونچے پہاڑ، گنگناتے جھرنے، ترنم ریز ندیاں، شیریں چشمے، بلوریں پانی کے جھیل اور ہری بھری وادیاں فطرت کے شیدائیوں کا من موہ لیتی ہیں۔ جو ایک بار یہاں آتا ہے وہ بار بار آنے کی تمنا کرتا ہے۔ کشمیر صرف اپنے فطری حسن کیلئے ہی جانا نہیں جاتا ہے بلکہ یہ وادئ گلپوش عرصہ دراز سے علم وادب کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں کے عالموں اور دانشوروں کے افکار نے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔

کشمیر زمانۂ قدیم سے ہی ایک علمی مرکز رہا ہے۔ بودھ مت اور شیومت سے وابستہ اسکالر یہاں آ کر علمی تشنگی کی تسکین کرتے تھے۔ بڑے بڑے شاعر، عروضی، قواعد کے ماہرین، منطق کے جاننے والے، فلسفی اور ادیب یہاں کے علمی ماحول سے فیضاب ہونے کیلئے دور دور سے یہاں آتے رہے ہیں۔ یہاں کے بادشاہوں اور حاکموں نے اپنے اپنے وقت میں باہر سے آنے والے لوگوں کی ہمیشہ پذیرائی کی ہے۔ چوتھی صدی عیسوی کے سنسکرت عالم کمار جیوا نے کشمیر سے چین جا کر چینیوں کو علم و آگہی کا پیغام دیا۔ پانچویں صدی سے بارہویں صدی عیسوی تک جو بڑے بڑے شاعر، ادیب اور دانشور کشمیر نے پیدا کئے اُن میں ماتری گپتا (۵۰۰عیسوی) پراوار یسینا دوم، بہما ہا، رتنا کارا، ادی شنکر، آنندوردھن، ابھنوگپت، ممٹ، بلہن اور کلہن کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کشمیر کی علمی اہمیت اور عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ہندو دھرم

کے ویدک کال میں ۱۸ شکتی پیٹھوں میں سے ایک اہم پیٹھ ''شاردا پیٹھ'' کشمیر میں تھا۔ یہ اپنے زمانے میں علم و آگہی کا بہت بڑا مرکز مانا جاتا تھا۔ جب تک بھارت میں سنسکرت کا چرچہ رہا، کشمیر کی دھرتی سے بھی اس زبان کے بڑے عالم و فاضل پیدا ہوتے رہے۔

بھارت میں سنسکرت کے چراغ کا روغن سوکھنے لگا تو کشمیر میں بھی لسانی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ ہندومت اور بودھ مت کی جگہ پر یہاں اسلام بڑی تیزی سے پھیلنے لگا۔ سنسکرت کی جگہ پر فارسی زبان نے علمی اور ادبی مراکز میں جگہ بنائی۔ کشمیری زبان نے بھی اسی زمانے میں اپنے پنکھ پھیلانے شروع کئے۔ چودھوی صدی عیسوی سے لیکر انیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک کشمیر میں فارسی زبان کا غلبہ رہا اور یہ زبان یہاں سرکاری زبان کے درجہ پر فائز رہی۔ کشمیریوں نے اس زبان میں بھی اپنی ذہانت اور قابلیت کا ثبوت دے کر ایران میں اپنی صلاحیت کے جھنڈے گاڑے۔ فارسی کے دور میں یہاں ملا طاہر غنیؔ (غنی کشمیری) اور شیخ یعقوب صرفی جیسے جید عالم پیدا ہوئے۔ غنی کشمیری کی تخلیقات نے برصغیر میں ادیبوں اور عالموں کے ایک بہت بڑے حلقے کو متاثر کیا۔ جن میں اردو کے عظیم شاعر مرزا غالبؔ اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال بھی شامل ہیں۔ شیخ یعقوب صرفیؒ ایک جید عالم اور فلسفی تھے۔ اُن کے افکار کو عالمی سطح پر وقعت اور اہمیت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ دوسرے عالموں اور ادیبوں میں بابا داؤد خاکیؔ، حبیب اللہ گنائی، مرزا داراب بیگ جواؔ، مرزا اکمل کاملؔ، ملا محمد توفیقؔ، محمد اعظم دیدمریؔ، بیربل کاچرو، تابارام ترکیؔ اور حسن شاہ کھوؔیہامیؔ کے نام شامل ہیں۔ مغل بادشاہ محمد شاہ کے دور میں محمد اصلاح نے ''تذکرہ فارسی شعرائے کشمیر'' میں ۳۰۲ فارسی شعراء کا ذکر کیا ہے۔

فارسی کے شانہ بشانہ کشمیر میں کشمیری زبان کو بھی فروغ حاصل ہوتا رہا۔ اگر فارسی یہاں کی ادبی محفلوں اور درباروں کی زینت تھی تو کشمیری یہاں کے عام لوگوں کی، یہاں کے گلی کوچوں کی اور یہاں کے لین دین کی زبان تھی۔ اس زبان میں ادب کا آغاز حضرت شیخ

العالمؒ اور للِ دید کی عقیدتی شاعری سے ہوا۔ شیخ العالمؒ کے کلام کو لوگ ''کاشر قرآن'' کے نام سے جانتے ہیں۔ جبکہ لل دید نے اس زبان میں عرفان وعقیدت کے زمزمے گا کر اس زبان کی آن اور شان بڑھادی۔ تب سے لیکر آج تک ہزاروں شاعروں، ادیبوں، عالموں اور دانشوروں نے اس زبان میں علم، عقیدت، عرفان، آگہی، تصوف، تاریخ اور دوسرے علوم کو پیش کر کے اس کو عالمی زبانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ بدلتے سماجی اور سیاسی دھاروں کے ساتھ کشمیری زبان وادب بھی اپنا چولا بدلتا رہا۔ جہاں اس زبان میں شمس فقیر، محمود گامی، صمد میر، رحمان ڈار، نعمہ صاب اور وہاب کھار جیسے سینکڑوں شعراء نے تصوف اور عقیدت کے نذرانے پیش کئے۔ وہی رسل میر حبہ خاتون اور ان کے قبیل کے دوسرے شعراء نے حسن و عشق کے گیت گا کر اس زبان کو رسیلا اظہار بخشا۔ جہاں اس زبان نے ترقی پسند خیالات کو زبان دے کر عبدالاحد آزاد، غلام احمد مہجور، امین کامل، بنسی نردوش اور اختر محی الدین جیسے کئی ادیبوں کو آسمان پر بٹھادیا تو وہی جدید اور مابعد جدید دور میں رحمان راہی، رشید نازکی، غلام نبی فراق، غلام نبی گوہر، غلام نبی آتش اور ان کے زمانے سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں شاعروں اور ادیبوں کی زبان بن کر انسانی درد وکرب، اندرونی خوف وخلش اور خارجی معاملات ومسائل کے اظہار کا وسیلہ بھی یہی زبان بنی۔ اگر چہ یہ زبان یہاں کے سرکاری ایوانوں اور درباروں تک رسائی حاصل نہ کرسکی لیکن یہ ہمیشہ عام لوگوں کے جذبات، احساسات، تجربات، مشاہدات اور خیالات کی ترجمانی کرتی رہی اور آج بھی یہاں کے عوامی حلقوں میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان یہی ہے۔

اُردو زبان ریاست میں دیر سے پہنچی۔ لیکن یہ اس زبان کی مٹھاس اور لطافت ہی ہے کہ بہت جلدی یہ ریاست کے عوام وخواص کو بھاگئی۔ اس زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ بڑی آسانی سے سمانے کی سکت موجود ہے۔ اس لئے یہ زبان بہت جلدی رابطے کی زبان بن جاتی ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں بھی رابطے کی سب

سے بڑی زبان اب اردو ہی ہے۔ اُردو یہاں کے تمام علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔
اس زبان کی ہر دل عزیزی کا ہی نتیجہ تھا کہ ۱۸۸۵ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اس کو جموں و کشمیر کی سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ اس سے پہلے ہی ریاست سے اُردو میں پہلا گزٹ ''بدیا بلاس'' شائع ہوا۔ ۱۸۷۲ء میں ہرگوپال خستہ نے اردو میں جموں و کشمیر کی پہلی تاریخ ''گلدستہ کشمیر'' لکھی۔ گلدستہ کشمیر کے شائع ہونے سے پہلے ہی اُردو یہاں پر عام و خاص کی زبان بن چکی تھی۔ کشمیر کے کاروباری اور تاجر لوگ سیاحوں کے ساتھ بات چیت کرنے کیلئے اسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ اس بات کا اعتراف ہرگوپال خستہ نے ''گلدستہ کشمیر'' میں بھی کیا ہے۔

> ''گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگ اُردو بولتے ہیں اور ہانجیوں وغیرہ طائفوں کے لوگ سیاح سیلانیوں کے ساتھ اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔''

تاریخی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جموں و کشمیر میں اردو زبان انیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنے پر پوری طرح پھیلا چکی تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں ہی اس کی مقبولیت اتنی بڑھ چکی تھی کہ اردو عام و خاص کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ اسی مقبولیت کے پیشِ نظر ۱۸۸۵ء میں گلاب سنگھ نے اس کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ اب ریاست کا سرکاری کاروبار اُردو زبان میں ہی ہونے لگا۔

ریاست جموں و کشمیر کے مراسم پنجاب کے ساتھ ہمیشہ سے رہے ہیں۔ ایک ہمسایہ ریاست ہونے کے ناطے یہ روا بھی ہے۔ پنجاب کے بڑے بڑے شہر، خاص کر لاہور صدیوں سے شعر وادب کا مرکز رہے ہیں۔ اردو انیسویں صدی کے اوائل میں ہی پنجاب میں اپنا غلبہ قائم کر چکا تھا اور اس کے شعر وادب کا ذوق ان شہروں میں خاصا نشونما پا چکا تھا۔ یہاں پر اُردو صحافت بھی کافی عروج پر تھی۔ ملک میں جو جو ادبی، سیاسی یا صحافتی تحریکیں اٹھی، وہ پنجاب کے راستے ہی ریاست جموں و کشمیر میں وارد ہوئی۔ یہاں تک کہ اُردو زبان وادب کا

سیلِ رواں بھی پنجاب کے راستے سے ہی کشمیر میں داخل ہوا۔

انیسویں صدی کے آواخر میں اُردو زبان و ادب کے پہنچنے کا ایک اور بڑا ذریعہ موسیقی تھی۔ پہاڑی سارنگ نواز جو گھوم گھوم کر لوگوں کو موسیقی سناتے تھے تک اُردو کی لے اور گانے پہنچ چکے تھے۔ ان کے اردو گانے بہت مقبول ہو رہے تھے۔ ان کے گیتوں اور غزلوں کو سننے کے بعد لوگ اُن کو گنگنائے پھرتے تھے۔ بہت سارے اشعار زبان زدِ خلائق ہو چکے تھے۔ مثلاً یہ اشعار۔

کیا خبر تھی انقلاب آسماں ہو جائے گا
یار سے ملنا نصیب دشمناں ہو جائے گا
دفن کرنا مجھ کو کوئے یار میں
قبر بلبل کی بنے گلزار میں

اردو میں رام لیلا کھیلنا، بھانڈ جشن دکھانا وغیرہ روایتوں نے زور پکڑا اور اُردو ریاست کے ہر حصے میں پھیل گئی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے سے ہی اردو زبان ریاست کے اسکولوں کی تدریسی اور نصابی زبان بن گئی اور میری یادداشت کے مطابق تقریباً ۲۰۰۰ء تک ریاست کی نصابی اور تدریسی زبان اردو ہی تھی۔ رنبیر سنگھ نے اپنے وقت میں ایک محکمہ تراجم بھی قائم کیا تھا۔ اس ادارے نے بہت ساری علمی کتابیں اردو میں ترجمہ کیں۔ غرض یہ کہ انیسویں صدی میں اردو ریاست کی زبان بن گئی اور جموں و کشمیر میں رابطہ کے سب سے بڑے وسیلے کے طور پر ابھری۔

بیسویں صدی کے آتے آتے ریاست نے اردو کے بڑے اور نامی گرامی ادیب پیدا کیے تھے۔ پریم ناتھ پردیسی، رام آنند ساگر، پریم ناتھ در۔ ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، خوشی محمد ناظر، محمد الدین فوق، امین بٹ، اثر صہبائی جیسے قلمکاروں نے اردو کو وہ مستحکم بنیاد فراہم کی،

جس کے دم پر اب کشمیر ہندوستان میں اردو کے ایک بہت بڑے مرکز کے طور پر جانا جاتا ہے۔

بیسویں صدی میں سینکڑوں قلمکاروں نے اردو کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ اردو زبان میں شعر و شاعری کے علاوہ اب تحقیق، تنقید اور تاریخ کا قابلِ قدر سرمایہ وجود میں آچکا تھا۔ اس صدی کی شروعات میں علی محمد لونؔ، شیخ بہادر بھانؔ، غلام رسول سنتوشؔ، شکیل الرحمانؔ، عبدالاحد آزاد، عبدالقادر سروریؔ، عرش صہبائیؔ، غلام محمد شوریدہ، شہ زور کاشمیریؔ، میر طاوس وغیرہ نے اردو کو بلندیاں عطا کیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں، نور شاہ، حامدی کشمیری، اکبر حیدری، پروفیسر محمد زماں آزردہؔ، عبدالغنی شیخ لداخی، حکیم منظور وغیرہ نے تحقیق، تنقید، تاریخ اور شعر و ادب کے اعلیٰ نمونے اردو میں پیش کئے۔ صرف اردو کے دلدادہ لوگوں نے ہی نہیں بلکہ کشمیری اور دوسری زبانوں سے محبت کرنے والے لوگوں نے بھی کشمیری اور دوسری علاقائی زبانوں کے کاز کو آگے بڑھانے کیلئے اردو کا سہارا لیا۔ اردو کا حلقہ اثر دیکھ کر اور اس زبان کی اہمیت کو بھانپ کر کشمیری لسانی تحریک سے وابستہ ادیبوں اور اس زبان کے خیر خواہوں نے کشمیری زبان و ادب کی تاریخ کو اردو میں پیش کیا۔ اس ضمن میں عبدالاحد آزاد کی تصنیف ''کشمیری زبان اور شاعری'' سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس روش نے کشمیری لسانی تحریک کے علمبرداروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا۔ اب یہ زبان صرف ادبی زبان ہی نہیں بلکہ برصغیرِ ہندو پاک کی سب سے بڑی مذہبی زبان بھی بن چکی تھی۔ خاصکر مسلمانوں نے اپنا مذہبی ادب اسی زبان میں پیش کیا۔ اب اس زبان سے لگاؤ ناگزیر تھا۔ اردو کی بڑھتی اہمیت دیکھ کر وہ لوگ بھی اس زبان کو وسیلہ اظہار بنانے کیلئے مجبور ہو گئے جن کا جینا مرنا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا فقط کشمیری زبان، ادب، ثقافت اور قوم کیلئے تھا۔ ایسی ہی شخصیات میں ایک قدآور اور بہت بڑا نام ''پرفیسر محی الدین حاجنیؔ'' ہے۔

پرفیسر محی الدین حاجنیؔ اصل میں عربی کے عالم تھے لیکن اُنہوں نے اپنی پوری زندگی کشمیری زبان وادب کو ترقی وترویج دینے میں صرف کی۔ وہ ایک جید عالم ہونے کے ساتھ ایک ہمہ جہت تحریکی علمبردار تھے۔ اپنے وقت کے منطقی، سائنسی، مذہبی اور معاشرتی علوم کے باریک بین عالم ہونے کے باوجود بھی وہ کشمیری زبان وادب سے لپٹے رہے۔ اُنہوں نے عربی میں بھی لکھا، انگریزی میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور اردو زبان کو بھی ذریعہ اظہار بنایا۔ لیکن جس بھی زبان میں لکھا، صرف اور صرف کشمیری کیلئے لکھا۔ کیونکہ اُنہیں کشمیر، کشمیری اور کشمیریوں سے بے پناہ محبت تھی۔

پروفیسر حاجنیؔ ''حاجن'' کے رہنے والے تھے۔ حاجن سرینگر سے تقریباً ۳۰ کلومیٹر دور شمال میں دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر واقع ایک قصبہ ہے۔ حاجن پوری ریاست میں کئی وجوہات کی بناء پر اپنا ایک نام اور مقام رکھتا ہے۔ اس علاقے میں بڑے بڑے دانشور، ادیب اور کشمیری لسانی تحریک کے علمبردار پیدا ہوئے ہیں۔ کشمیری زبان کے سب سے بڑے بسیار گو شاعر ''عبدالوہاب پرے حاجنیؔ'' اسی زمین کی پیداوار ہے۔ وہاب پرے حاجنی کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ اُنہوں نے ''فردوسی'' کی شہرہ آفاق تصنیف ''شاہنامہ'' کا کشمیری زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ اسی بنیاد پر اُنہیں ''فردوسیٔ کشمیر'' کے لقب سے جانا جاتا ہے۔ کشمیری زبان کے سب سے بڑے مذہبی شاعر ''مولوی صدیق اللہ'' بھی حاجن میں ہی پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ اُن کی لکھی ہوئی ''بدائع منظوم'' اور ''شکل وشمائل آنحضرتؐ'' کشمیری ادب میں ایک الگ باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسد پرے جیسے مبہم صوفی شاعر کا مسکن بھی حاجن ہی رہا ہے۔۔ شریف النفس مگر پرعزم لسانی اور تنظیمی کارکن، ادبی رضا کار اور کشمیری زبان کے بہت بڑے خیر خواہ محمد احسن احسنؔ بھی اسی گلستان کا گلاب ہے۔ آج کے دور میں کشمیری لسانی تحریک کے علمبردار ڈاکٹر عزیز حاجنیؔ نے بھی اسی زمین پر جنم لیا ہے۔ ادبی اور لسانی سرگرمیوں کیلئے یہ زمین بہت زرخیز اور مردم خیز رہی ہے۔ ریاست کی بہت پرانی ادبی تنظیم

حلقہ ادب سونارواری کی بنیاد یہاں ہی پڑی اور پچھلے ساٹھ سالوں سے یہ تنظیم کشمیری زبان و ادب کی آبیاری کرنے میں کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہی ہے۔ شمالی ہندوستان کی گراں قدر لسانی تنظیم اور تحریک ''ادبی مرکز کمراز'' کے قیام کے پیچھے بھی حاجن ہی ایک محرک رہا ہے۔ حاجن ایک ادبی چشمہ ہے۔ اس چشمہ نے وادی کے ادبی اور لسانی بنجر کوزرخیز بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ کئی تشنگانِ ادب اپنی پیاس بجھانے کیلئے آج بھی اس چشمے سے رجوع کرتے ہیں۔ حاجن کی اسی ادبی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے وادی کے نامور محقق اور مورخ جناب محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں۔

> ''حاجن کو کشمیر میں وہی مقام حاصل ہے جو مقام بدایوں کو اُتر پردیش میں حاصل ہے[1]''۔

ملک کے نامی اور گراں قدر ادیب، نقاد اور محقق پروفیسر محمد زماں آزردہ کو حاجن کے ساتھ بے پناہ اُنس ہے۔ حاجن کی ادب نوازی کا اعتراف انہوں نے ایک مجلس میں (جس میں بذاتِ خود میں بھی موجود تھا) یہ کہہ کر کیا ہے۔

> ''حاجن کو کشمیری زبان وادب کیلئے وہی مقام حاصل ہے جو مقام اردو کیلئے لکھنؤ کو حاصل ہے۔ یہاں اگر کوئی شخص گھپ بھی ہانکتا ہے تو وہ شعر ہوتا ہے۔[2]''

اب اس علاقہ کی اہمیت اور افادیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ یہ قصبہ پوری وادی

---

۱ پیشِ لفظ ''کلیاتِ اسد پرے'' مطبوعہ ریاستی کلچرل اکادمی

۲ یومِ الطاف نیاز کے موقعہ پر حاجن ہائر اسکنڈری میں کہا

میں اپنی زرعی پیداوار، پشو پالن اور باغبانی کے لئے بھی مشہور ہے۔ لیکن اس کی علمی، ثقافتی اور ادبی پہچان ہی اصل میں اس کا خاصہ ہے۔ اس پہچان کو برقرار رکھنے کیلئے ہمارے اکابرین نے اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ اپنے اسلاف کی روشن کی ہوئی مشعل کو فروزاں رکھنے کیلئے یہاں کے نوجوان ادیب اور لسانی رضا کار اُن کے نقشِ قدم پر چل کر بحسن وخوبی اپنا حاجنی ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔

ہاں۔ آج سے تقریباً ۹۱ سال پہلے اسی تمدن ساز اور ادب نواز قصبہ کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ایسا پھول کھلا کہ اُس نے اپنی مہک سے گردونواح کے ماحول کو معطر کر دیا۔ جہلم کے پانی کو مشکبار بنا دیا۔ اس پھول نے قدیم اور جدید رنگ و بو کو سمیٹ کر ایک ایسی انفرادیت قائم کر لی کہ اسکی انفرادیت ہی اسکی پہچان بن گئی۔ اسی علامتی پہچان کا نام ''محی الدین حاجنیؔ'' ہے۔ جو تمام عام وخواص، یار واحباب، چھوٹے بڑوں اور اپنے پرائیوں میں پروفیسر حاجنیؔ کے نام سے جانے جاتے تھے اور اسی نام سے وادی کے مرد وزن اُن کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔

پروفیسر حاجنیؔ کے اجداد حاجن کے پرے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کا پیشہ زمینداری تھا۔ حاجنیؔ صاحب کا خاندانی پسِ منظر دیکھا جائے تو ہمیں کہیں بھی کوئی شاعر یا ادیب نظر نہیں آتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حاجنیؔ صاحب کو علم وآگہی وراثت میں نہیں ملی تھی۔ حاجنی صاحب کے والد کا نام ''نبر پرے[۱]'' تھا اور دادا کا نام حاجی عبدالرحمان پرے۔ ماں کا نام ''اشہ بیگم'' تھا۔ جو حاجن کے پرے خاندان کی ہی بیٹی تھی۔

مقامی معلومات اور سرکاری ریکارڈ کے مطابق حاجنی صاحب ۲۲ / جون ۱۹۱۷ء کو حاجن کے پرہ محلہ میں[۲] پیدا ہوئے۔ لیکن اوتار کرشن رہبر اور غلام نبی خیالؔ اس کے برعکس اُن کا یوم

۱۔ غلام نبی پرے کو عرفِ عام میں نبر پرے کہتے تھے۔

۲۔ ''پروفیسر حاجنیؔ'' از عزیز حاجنیؔ مطبوعہ ''بازیافت'' شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۳ء

پیدائش ۲۱ ر جون ۱۹۱۷ء [1] بتاتے ہیں۔ حاجنی صاحب نے خود بھی اسی تاریخ کی تصدیق کی ہے [2]۔

محی الدین ابھی زندگی کی پہلی بہار ہی دیکھ رہے تھے کہ اُن کے والد اپنے فرزند کا بہار دیکھے بغیر ہی اس دُنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔ چونکہ اس زمانے میں لوگوں میں سادگی اور خوفِ خدا بہت زیادہ تھا۔ اس لئے یتیم محی الدین کی پرورش اُس کے رشتہ داروں نے بہت ہی لاڈ پیار سے کی۔ اگر پیارے نبیؐ کے سرِ مبارک سے والد محترم حضرت عبداللہ کا سایہ اٹھا۔ لیکن اللہ کو منظور یہ تھا کہ آپ ﷺ کی پرورش آپ ﷺ کے شفیق چچا حضرت ابو طالب کو نصیب فرمائی۔ محی الدین بھی اس معاملے میں کافی خوش نصیب رہے۔ باپ کا سایہ اللہ نے سر سے اُٹھایا تو ان کی پرورش بھی اُن کے شفیق چچا لسی پرے کے نصیب میں لکھی تھی۔ جنہوں نے ان کی پرورش میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ لسی پرے پیشے سے مستقل زمیندار اور جزوی طور پر تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست پُر مغز اور ہوشیار انسان تھے۔ اُن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ طبیعتاً حساس اور خدا پرست ہونے کے ساتھ ساتھ اولیاء کے زبردست متعقد تھے۔ انہوں نے محی الدین کی پرورش بالکل مذہبی طور طریقوں سے کی اور جوں ہی محی الدین نے ہوش سنبھالا اُنکو رواج کے مطابق حاجن کے پرائمری اسکول میں درج کیا۔ ایڈمیشن ریکارڈ کے مطابق اُنہیں ایڈمیشن نمبر ۱۵۰ (ایک سو پچاس) کے تحت ۱۱ ر جون ۱۹۲۳ء کو درج کیا گیا۔ اُس وقت حاجنی صاحب کی عمر پانچ سال گیارہ مہینے اور نو دن تھی [3]۔

چونکہ اُن دنوں حاجن ایک پسماندہ گاؤں تھا۔ جہاں لوگوں کا گذارہ عام طور سے کھیتی باڑی پر ہی ہوتا تھا۔ صنعتی اور سائنسی انقلاب کے بارے میں یہاں کے لوگ اُن دنوں اتنا ہی

۱۔ ''کوشرنثر'' از رہبر و خیال مطبوعہ کلچرل اکادمی

۲۔ ''کاشُر شاعری'' مطبوعہ ساہتیہ اکادمی ۱۹۶۰ء

۳۔ ''پروفیسر حاجنی حالاتِ زندگی'' از ڈاکٹر عزیز حاجنی مطبوعہ ''شیرازہ'' کلچرل اکادمی

جانتے تھے۔ جتنا ایک پسماندہ علاقے کے لوگ جان سکتے ہیں۔ اس لئے تعلیم کا مطلب اُن لوگوں کے نزدیک فارسی اور عربی کے ایک دو قاعدے پڑھنے سے زیادہ نہ تھا۔ حالانکہ حاجن میں پروفیسر محی الدین حاجنیؔ سے پہلے بھی بڑے شاعر پیدا ہوئے تھے۔ جن میں مولوی صدیق اللہ، وہاب حاجنیؔ، رمضان ڈار، اسد پرے وغیرہ قابل قدر ہیں۔ لیکن حاجنیؔ صاحب کی شخصیت ایک ہمہ جہت شخصیت تھی، حاجن میں علم وآ گہی کا سب سے بڑا مرکز وہی پرائمری اسکول تھا۔ جسمیں محی الدین کو داخل کیا گیا۔ محی الدین نے اسی اسکول سے پرائمری درجہ (پانچویں) کا امتحان پاس کیا۔ اب مزید تعلیم حاصل کرنے کیلئے حاجنیؔ کو یا تو سوپور جانا تھا، یا پھر سرینگر۔

چونکہ اُن دنوں ٹرانسپورٹ کی سہولیات صرف گھوڑے اور کشتی کی صورت میں دستیاب تھی۔ اسلئے سرینگر جانے سے آسان سوپور جانا تھا۔ سوپور کا راستہ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ حاجن والوں کا وہاں رشتہ داری اور دیگر معاملات زندگی کے سلسلے میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اسلئے محی الدین کے سامنے ہر صورت میں سوپور کی ہی صورت تھی لیکن یتیم، کم عمر اور گھر والوں کا چہیتا ہونے کی وجہ سے گھر والے اُنہیں سوپور بھیجنے کیلئے تیار نہ ہو سکے۔ اسلئے ڈھائی سال تک اُن کو گھر میں ہی رکھا گیا۔ آخر کار ۱۹۳۱ء میں کچھ لوگوں کے اصرار کے بعد حاجنیؔ کو سوپور کے ہائی اسکول میں جماعت ششم میں داخل کر دیا گیا۔ سوپور کے حاتی شاہ محلہ میں حاجی عبدالغفار کیمہ کے گھر میں اُن کے رہنے کا انتظام کیا گیا۔ اسکے علاوہ ۱۹۳۴ء میں تاروز سوپور میں بھی کچھ وقت کیلئے قیام کیا۔

یہ زمانہ شخصی راج کا زمانہ تھا۔ ورمُل، سوپور اور کپوارہ، ان تین قصبوں میں صرف ایک سرکاری ہائی اسکول تھا اور وہ سوپور میں تھا۔ ورمُل ضلع صدر مقام ہونے کے باوجود بھی وہاں پر کوئی بھی سرکاری ہائی اسکول نہیں تھا۔ البتہ وہاں پر دو غیر سرکاری ہائی اسکول، سینٹ جوزف اور نیشنل ہائی اسکول تھے۔ سوپور کے سرکاری ہائی اسکول میں محی الدین نے ۱۹۳۶ء میں

دسویں (Matric) کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ اور مزید تعلیم حاصل کرنے کیلئے حاجن کے فرزند کو سرینگر کی راہ اختیار کرنی پڑی۔ جہاں پر انہوں نے سری پرتاب (S.P.College) کالج میں داخلہ لیا۔ اسی کالج سے انہوں نے ۱۹۴۰ء میں اعزاز کے ساتھ بی۔اے۔ آنرز (B.A.Honours) کی ڈگری حاصل کی۔ سرینگر میں نواکدل کے غلام رسول کنڈ جی کے گھر میں اُن کا ڈیرہ تھا۔[1]

جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے کہ حاجن ایک پسماندہ گاؤں تھا۔ لیکن ادیب پیدا کرنا اس کی مٹی کی خصوصیت رہی ہے۔ اسی وجہ سے حاجن کو کشمیر میں وہی اہمیت حاصل ہے۔ جو اہمیت قصبہ ''بدایوں'' کو اُتر پردیش میں حاصل ہے۔ محی الدین حاجنی سے پہلے بھی مذہبی عالم اور ادیب حاجن میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ان شخصیات نے کشمیری زبان وادب کی آبیاری اپنے اپنے مقدور کے مطابق کیں۔ یہ تمام حضرات عقیدتاً پکے مسلمان تھے۔ چونکہ حاجن میں سخت مذہبی ماحول تھا اسلئے وہاں پر دینی اور عربی تعلیم کو ہی مقدم سمجھا جاتا تھا۔ ''محی الدین بھی ایک عالمِ دین بن کر پورے علاقے کو دین کی روشنی سے منور کردے۔'' یہی آرزو محی الدین کے بچپن سے ہی اُن کے شفیق چچا لسی پرے کے دل میں پنپ رہی تھی اور اب وہ وقت آیا جب حاجنی اپنے پالنہار کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرسکتے تھے اور اسی مقصد کیلئے ۱۹۴۰ء[2] میں مالی مشکلات کے باوجود ہمدرد لسی پرے نے محی الدین کو مزید تعلیم و آگہی کیلئے علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم۔اے۔ عربی کورس (Course) کیلئے اُن کا ایڈمیشن ہوا۔ لیکن حاجنی صرف ماسٹر آف آرٹس بن کر حاجن واپس نہیں آئے۔ بلکہ وہ وکالت کی ڈگری (L.L.B) اور صحافت میں ڈپلوما (Diploma in Journalism) کی اسناد بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ اس سے بڑھ کر حاجنی کی ذہانت،

---

[1] بحوالہ ''شیرازہ'' کلچرل اکادمی

[2] محی الدین حاجنی ''ہندوستانی ادب کے معمار'' از نشاط انصاری

قابلیت اور محنت کا کیا ثبوت ہوسکتا ہے، کہ جہاں عام طالب علم ایک ڈگری صد صدقے و نیاز کی بدولت حاصل کرتے تھے۔ وہاں حاجن کے محی الدین نے اپنی محنت اور ذہانت سے تین ڈگریاں ایک ہی وقت میں امتیازات کے ساتھ حاصل کرلیں۔ اس کے علاوہ وہ یونیورسٹی کے لیٹن کتاب خانے کے مخطوطات شعبہ میں جاکر تحقیقی مطالعے میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔ اسی کتب خانہ سے انہوں نے ''کتاب الطّواسین'' کا ترجمہ اور تفسیر لکھنی بھی شروع کی۔[1]

انگریزی کی مشہور کہاوت ہے کہ۔

"Some are born great, Some achieve greatness and greatness is thrusted upon some."

جہاں تک پروفیسر محی الدین حاجنؔی کا تعلق ہے۔ اُنکے بارے میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ۔

" He achieved greatness by his intellectual ability and hardwork".

حاجنی صاحب کو تعلیم حاصل کرنے کا انتہائی شوق تھا۔ علی گڑھ بھی اسی وجہ سے بھیجے گئے تھے۔ اُن کے شوق و ذوق کا حال یہ تھا کہ ایک دن وہ پڑھنے کی فکر میں ہوسٹل سے پاجامے کے بغیر ہی نکلتے ہوئے دیکھے گئے۔ اس واقعہ کے متعلق غلام نبی گوہؔر نے خواجہ مبارک شاہ کا حوالہ دیکر کہا ہے کہ۔

> ''ایک دن ہم بیٹھے ہوئے تھے اور شاہ صاحب نے پروفیسر حاجنؔی سے کہا'':۔ ''تم ایم۔اے۔ کلاس سے فارغ ہوکر آئیے تھے۔ اور جرنلزم کے اُستاد سے بھی نوٹس لے چکے تھے۔ اور شاید لائبریری میں بھی کچھ ذہن کھپا کر آئے ہوئے تھے۔ کمرے میں کتابیں بدلنی تھیں اور شاید کپڑے بھی بدلنے تھے۔ اتنے میں شعبۂ قانون سے گھنٹا بجا۔ تو آپ

---

[1] ''اقبال اور حلاج'' از پروفیسر حاجنی از پروفیسر حاجنی ''محفل اقبال'' کلچرل اکادمی ۱۹۷۷ء

دوڑ کر باہر آئے۔ ہم لان میں منتظر تھے۔ اور جونہی یہ صاحب کمرے سے باہر نکلے ہم انہیں دیکھ کر قہقہہ ضبط نہ کر پائے۔ اس کو کمرے میں واپس جانے کیلئے اصرار کرتے رہے مگر وہ ایک نہ سن پائے۔ تو ہم نے اُنکو جبراً کمرے میں واپس لے کر یہ دکھایا کہ وہ سر پر ٹوپی بھی پہنے ہوئے تھے۔ شیروانی کے بٹن بھی بند تھے۔ بوٹ کے تسمے بھی چڑھائے تھے۔ مگر ٹانگیں ننگی۔ یہ حال دیکھ کر کوئی تاثر نہ دیا۔ بس پاجامہ پہن کر کلاس کو چل دیئے۔"[1]

عصر حاضر میں جب کہیں والدین اپنی اولاد کو اونچی تعلیم دینے کا قصد کر لیتے ہیں۔ تو سب سے پہلے ایک بات کی گانٹھ باندھتے ہیں کہ جب تک نہ اُن کی اولاد اپنی تعلیم مکمل کر کے نوکری حاصل کرے۔ تب تک اُن کی شادی نہیں ہوگی۔ چونکہ حاجنیؒ ایک گاؤں کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہو کر پلے بڑے تھے۔ اسلئے اُن کے ساتھ اس کے برعکس ہوا۔ گاؤں کے رسم و رواج کے مطابق شادیاں چھوٹی عمر میں ہی ہوتی ہیں۔ اور آج حاجن ایک ٹاون (Town) ہونے کے باوجود بھی ماں باپ اس فرض کو عام طور پر عجلت میں ہی انجام دیتے ہیں۔ چونکہ محی الدین حاجنی یتیم تھے۔ شاید اسی لئے، کسی حق ادائی کی سبب یا فرض کو انجام دینے کی غرض سے اور پھر سب سے بڑھ کر لاڈ و پیار کی وجہ سے اُن کے معاملے میں زیادہ ہی عجلت سے کام لیا گیا۔ اُن کی شادی اُس وقت ہوئی۔ جب انہوں نے سوپور کے سرکاری ہائی اسکول کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ سرینگر کے ایس۔ پی۔ کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تو دور کی بات ہے۔ شادی کے وقت حاجنی صاحب حاجن کے واحد تعلیمی ادارے پرائمری اسکول حاجن میں ہی اپنے بچپن کے دن گذار رہے تھے اور تیسری جماعت میں ہی پڑھتے تھے۔[2]

---

[1] ''حاجنیؒ ایک متحرک دار المعارف'' از غلام نبی گوہر مطبوعہ ''بازیافت'' شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۳ء

اُن کی بیوی کا نام "سروہ" تھا۔ وہ ایک اَن پڑھ اور سیدھی سادھی گھریلو عورت تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ حاجنیؔ صاحب کے عالمانہ مزاج کی قدر شناس اور قدر دان تھی۔ صغر سنی میں شادی کے باوجود بھی حاجنیؔ صاحب اپنی پڑھائی کے شوق میں مست رہے۔ اس عمر میں شادی کے بعد اُنکے حصول تعلیم کے معاملے اور باقی معاملاتِ زندگی پر کوئی منفی اثر نہ پڑنا اُن کی خود اعتمادی کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ ورنہ اس عمر کی شادیاں اکثر ناکام ہو کر طرفین کیلئے وبال جان بن جاتی ہے۔ حاجنیؔ صاحب کی شادی ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ جب اُن کی عمر صرف دس سال تھی۔ اس بارے میں عزیز حاجنیؔ کہتے ہیں۔

"اُنکی شادی صغر سنی یعنی دس برس کی عمر میں کی گئی۔"[1]

جبکہ ملک راج صراف اُنکی عمر شادی کے وقت تیرہ سال لکھتے ہیں۔ اسطرح عزیز حاجنی اور ملک راج صراف کے بیانات میں تفاد پایا جاتا ہے۔ لیکن جب میں نے کچھ بزرگوں اور حاجنیؔ صاحب کے رشتہ داروں سے اس بارے میں بات کی۔ تو انہوں نے ڈاکٹر عزیز حاجنیؔ کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ "محی الدین تیسری یا چوتھی جماعت میں شادی کے وقت پڑھتا تھا۔" میرے دادا جی بھی حاجنیؔ صاحب کے ہم جماعت تھے۔ انہوں نے بھی ایک دن مجھ سے یہی کہا تھا۔ کہ "میں نے صرف تیسری جماعت تک پڑھا ہے۔ محی الدین میرے ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ جس سال میں نے اسکول چھوڑ دیا تقریباً اُسی سال محی الدین کی شادی ہوگئی۔"

چاہئے دس سال ہو یا تیرہ سال حقیقت یہ ہے کہ حاجنیؔ صاحب کی شادی بہت ہی کم سنی میں ہوئی اور اس کے باجود انہوں نے جو مقام حاصل کیا وہ اُن کی لگن کا محنت کا پتہ دیتا ہے۔

---

[1] "پروفیسر محی الدین حاجنیؔ" از ڈاکٹر عزیز حاجنیؔ مطبوعہ "بازیافت" شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۳ء

سورج کو تخلیق اسی لئے کیا گیا ہے کہ وہ پورے عالم کو منور کردے۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً بڑے بڑے اولوالعزم اور جلیل القدر انسان بھی ظلمت کے اندھیروں کو مٹانے کیلئے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ پروفیسر حاجنیؔ بھی اُنہی جلیل القدر لوگوں میں سے تھے جو قوم کی فلاح و بہبود کیلئے ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں۔ سوپور ہائی اسکول میں پڑھنے کے دوران ہی حاجنیؔ صاحب کی زندگی کی مختلف جہتیں سامنے آنی لگیں تھیں۔ کلاس میں اپنی قابلیت سے انفرادیت قائم کرنے کے علاوہ انہوں نے کچھ ملی، سیاسی اور صحافتی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب مظلوم کشمیری شخصی راج کے ظلم کے خلاف منظّم ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ مسلم کانفرنس کی بنیاد کے ساتھ تحریک حریت بھی شروع ہوچکی تھی۔ مسلم کانفرنس کے کاز کو آگے لے جانے کیلئے نوجوان طالب علموں کی ایک جماعت ''مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسیشن'' وجود میں آچکی تھی۔ حاجنیؔ صاحب اس تنظیم کے جنرل سیکریٹری جبکہ غلام نبی نمدہ گر واس کے صدر تھے۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام ۱۹۳۳ء میں شخصی حکمرانی کے خلاف ایک بہت بڑا احتجاجی جلوس نکالا گیا[1]۔ حاجنیؔ صاحب اس جلوس کے ہراول دستے میں شامل تھے۔ جلوس پر پولیس نے دھاوا بول دیا اور لاٹھی چارج کیا۔ بہت سارے طالبِ علم گرفتار کئے گئے۔ گرفتار کئے گئے طالب علموں میں حاجنیؔ صاحب بھی تھے۔ ان تمام طالب علموں سے پوچھ تاچھ کی گئی اور برما آرڈننس (Burma Ordinance) کے تحت انہیں سزا دی گئی۔ اس طرح حاجنیؔ صاحب کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔

۱۹۴۲ء میں حاجنی صاحب نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ عربی اور ایل۔ ایل۔ بی پاس کر کے مقامی طور پر ایک عجوبہ قائم کیا۔ ایم۔ اے۔ کا رزلٹ (Result) آنے کے ساتھ ہی وہ ۱۹۴۲ء میں جموں کے ''پرنس آف ویلز کالج'' میں بحیثیت لیکچرار تعینات ہوئے۔ جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے کہ حاجنیؔ صاحب نے ایل۔ ایل۔ بی۔

---

[1] ''محی الدین حاجنیؔ منزلہ پیٹھ مزار س تام'' از ڈاکٹر عزیز حاجنیؔ ''ولر کر ملر'' حلقہ ادب سوناواری

کی ڈگری بھی حاصل کی تھی۔ یعنی وہ وکالت کا پیشہ اختیار کر کے اپنی ذہانت سے اس پیشے میں نام کمانے کے علاوہ بہت سارا پیسہ بھی کما سکتے تھے۔ لیکن ایک پکہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ حاجنؔی ایک بے لوث اور صاف دل انسان بھی تھے۔ اسلئے اُن کی طبیعت نے وکالت کا پیشہ اختیار کر کے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنا گوارا نہیں کیا اور حقیقت یہ بھی ہے کہ اللہ نے اُنہیں ایک معلم کے طور ہی پیدا کیا تھا۔ اسی لئے انہوں نے پیغمبروں کا پیشہ اختیار کر کے مدرّس کا کام انجام دیا۔

جموں کے پرنس آف ویلز کالج میں حاجنؔی صاحب سات سال رہے اور اسکے بعد اُن کا تبادلہ سری پرتاب کالج سرینگر میں ہوا۔ یہاں وہ ترقی کرتے ہوئے پہلے ریڈر اور پھر پروفیسر بنے۔ اس کالج میں حاجنی صاحب کے ادبی ذوق میں نکھار آیا۔ یہاں پڑھانے کے ساتھ ساتھ وہ مباحثوں اور سیمیناروں وغیرہ کا اہتمام بھی کرتے رہے۔ وہ کافی عرصہ تک پرتاب میگزین کے کشمیری سیکشن کے ایڈیٹر اور میگزین کے کنویزر رہے۔ اس کالج کے آفیشل آرگن Discourses میں ان کے کئی انگریزی مضامین شائع ہوئے۔ ان مضامین کے مطالعے سے حاجنی صاحب کی علمی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ آخر کار وہ ۱۹۷۲ء میں اسی کالج سے سبکدوش ہوئے۔[1]

حاجنؔی صاحب عملی طور پر کوئی سیاستداں نہیں تھے۔ لیکن یہاں کی سیاست کے متعلق وہ اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتے تھے۔ اپنے سیاسی نقطہ نظر کو انہوں نے کبھی بھی مصلحت یا مجبوری کی نظر نہیں کیا۔ چونکہ حاجنی صاحب انتہائی درجہ کے خوددار، دلیر اور صاف گو انسان تھے اس لئے وہ خوف اور ڈر کے اپنے مشاہدات، تجربات اور محسوسات کا اظہار تحریری اور تقریری دونوں صورتوں میں کرتے رہے۔ یہاں کے سیاستدانوں اور اربابِ اقتدار کے خلاف وہ ہمیشہ طنز

---

[1] محی الدین حاجنؔی ''ہندوستانی ادبکے معمار'' از نشاط انصاری ساہتیہ اکادمی

آمیز لہجہ اختیار کرتے تھے۔ جسکی وجہ سے انہیں اکثر دھمکیاں نصیب ہوتی تھی۔ لیکن حاجنی نے کبھی بھی اپنے انفرادی اظہار سے کنارہ نہیں کیا۔ نتیجتاً اُنہیں دو بار جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ وہ پہلی بار ۱۹۴۷ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۶۵ء میں نظر بند کئے گئے۔ ۱۹۶۵ء کی نظر بندی کے دوران انہوں نے ''مقالات'' نام کی وہ اہم نثری کتاب لکھی۔ جس کے لئے اُنہیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مقالات کشمیری نثر کی بہترین کتاب ہے۔ دوسری نظر بندی کے دوران ہی ان کی شفیق بہن سعیدہ بیگم اور پھر ۱۹۶۶ء میں اُن کی ماں اشہ بیگم انتقال کر گئیں۔ ماں کے انتقال کے تقریباً چھ (٦) سال بعد ۱۹۷۲ء میں اپنی نیک بیوی کی رفاقت سے بھی محروم ہو گئے۔

حاجنی صاحب کے باغیرت، خوددار اور صاف گو ہونے کی سب سے اہم وجہ اُن کا خدا پرست اور دیندار ہونا تھا۔ وہ صوم وصلوٰتہ کے سخت پابند تھے اور ہمیشہ پنجگانہ نماز پڑھتے تھے۔ روزہ مکمل طور پر شریعت کے لحاظ سے رکھتے تھے اور باقی اسلامی عقائد کی پیروی بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۴ء میں سفر محمود پر جا کر حج بیت اللہ کا فریضہ بھی انجام دیا۔ اُن کے ساتھ اُن کی بڑی اور فرمانبردار بیٹی حلیمہ بھی تھی۔

اولوالعزم لوگ ہمیشہ موت کو ایک نئی زندگی کی ابتدا سمجھ کر زندگی اور موت کو لازم ملزوم سمجھتے ہیں، اسلئے وہ ہمیشہ زندگی کے قیمتی لمحات کی قدر کرتے ہوئے انہیں ضائع نہیں کرتے۔ حاجنیؔ بھی ایک برگزیدہ انسان تھے، اسلئے وہ چاہیے آنکھوں کے مرض میں مبتلا رہے یا کسی اور بیماری میں، موت سے نہ ڈرتے ہوئے وہ ہمیشہ زندگی کے قیمتی لمحات میں کچھ کرنے کی سعی کرتے رہے اور اپنی بیماری سے بے فکر ہو کر وہ تحقیق وتخلیق کے کاموں کے علاوہ دوسرے تنظیمی امور میں مشغول رہے۔ اسی لئے بہت سارے امراض اُن کو دامن گیر ہو گئے۔ لیکن اپنی زندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ اوروں کیلئے زندگی کے راستے آسان کرتے گئے۔ دل کی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ ایسے کہ اُنہیں دلی لے جانا پڑا۔ لیکن بے خبری کے عالم میں۔ اُنہیں پتہ چلتا تو شاید بیماری کی حالت میں ہی بھاگ کر آتے۔ آخر کار جب پتہ چلا۔ تو غصے

سے بے قابو ہوکر احسنؔ صاحب پر برس پڑے اور کہا۔

''آپ لوگ موت سے کیوں لڑ رہے ہو میں اس وقت تریسٹھ سال کا ہوں۔ فخرِ کائنات آنحضورؐ کی بھی یہی عمر تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری کم عقل کی وجہ سے میں وہاں پہنچا۔ جہاں کی مجھے بچپن سے ہی نفرت ہے۔''[1] (ترجمہ)

اگرچہ دہلی کے کے۔سی۔ پنت اسپتال میں حاجنیؔ صاحب کے ساتھ موجود تیماردار اُن کی اس شدت پسندی کو جہالت سمجھتے تھے۔لیکن حقیقت میں اُن کی اس کوشش سے کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ اگرچہ اس واقعے کے بعد حاجنی صاحب تیرہ سال تک زندہ رہے۔لیکن وہ محض ایک زندہ لاش بن کر رہے۔ کیونکہ اسکے بعد نہ ہی حاجنیؔ کچھ لکھ سکے، نہ چل سکے اور نہ ہی کچھ پڑھ سکے۔

پروفیسر محی الدین کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ مذہبی معاملات میں زبردست دلچسپی لیتے تھے۔معاملہ چاہیے مذہبی مباحث کا ہو یا پھر کسی مذہبی غلط فہمی کا۔ وہ انسان کو منطقی دلیلوں اور قرآن واحادیث کے حوالوں (Refrences) سے مطمئن کرتے تھے۔اس کے علاوہ وہ مذہبی عبادت گاہوں کی تعمیر میں بھی زبردست دلچسپی لیتے تھے۔جس کی ایک زندہ مثال حاجن کی جامع مسجد ہے۔جس کو انہوں نے اپنے گھر کے باہر ہی تعمیر کیا۔ حاجنیؔ صاحب علالت سے پہلے لگاتار اس مسجد میں جمعہ کے دن خطبہ دیتے اور امامت بھی کرتے تھے۔نماز کے فوراً بعد وہ مسجد کے لان میں ایک بورڈ لگاتے اور وہاں پر لوگوں کے مذہبی اور دیگر سوالات سُنتے اور پھر لوگوں کو اُن کے سوالات کے جوابات دیتے۔ وہ حاجن کی اوقاف کمیٹی کے جنرل سیکریٹری تھے۔اس کے علاوہ چند اعلیٰ پایہ کے اسلامی اداروں کے ساتھ بھی

---

[1] ''پروفیسر حاجنیؔ منزلہِ پیٹھ مزارس تام'' از عزیز حاجنی، مطبوعہ، وولر کی حاجنی نمبر (حلقہ ادب سوناواری)

وابستہ رہے۔ان اداروں میں رابطہ عالم اسلامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔جس کے حاجنؔی صاحب ممبر تھے۔

ذاتی طورطریقوں سے حاجنی صاحب ہمیشہ سادگی پسند رہے۔ان کے لباس میں ایک لمبا اچکن،سفید پائجامہ،قراقُلی ٹوپی،چمڑی (Leather) جوتا شامل ہوتا تھا۔مشاغل میں وہ تاش کھیلنا اورآتش بازی کا تماشہ دیکھنا پسند کرتے تھے۔[1]

محی الدین حاجنؔی قدیم وجدید خصوصیات کا ایک امتزاج تھے۔اُن کی علمی سوچ مغربی طرز کی تھی۔لیکن دل پر مشرقیت کی ایک چھاپ تھی۔حالانکہ اونچی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی وہ مغربیت کے دلدادہ نہیں بنے۔اُن کے رہن سہن اور دیگر معاملاتِ زندگی میں جہاں مذہب کا زبردست اثر تھا۔وہی اُس پر مشرقیت بھی چھائی ہوئی تھی۔فیشن پرستی سے حاجنؔی اس حدتک بے نیاز تھے کہ انہوں نے کبھی کلائی پر گھڑی نہیں باندھی۔نہ کبھی اپنی زندگی میں نیکٹائی کا استعمال کیا۔بلکہ کبھی کبھار اپنے اُن دوستوں،جونیکٹائی پہنتے تھے،پرزبردست طنز کے تیر چلاتے۔اس بارے میں آئینہ کے مدیر[2] اُن کا خاکہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''حاجنؔی صاحب ہمارے پروفیسروں کی بالشتہ قدنسل میں دیوزاد نظر آتے ہیں۔ وہ نیکٹائی اور کتابی چہرے کی سند لے کر کلاس میں نہیں جاتے۔ بلکہ نقدعلم وحکمت لے کر وہ عربی کے پروفیسر ہیں۔لیکن سائنس،آرٹ،اورنفسیات پراُن کی نظر گہری ہے۔وہ اپنی ظاہری شکل وشباہت سے بے پرواہیں۔مگراس میں قلندری کی شان بے نیازی ہے۔''[2]

---

[1] ''پروفیسر حاجنؔی منزلہِ پٹھ مزارس تام'' ازعزیز حاجنی،مطبوعہ،وولرکی حاجنی نمبر(حلقہ ادب سوناواری)

[2] ہفتہ روزہ آئینہ ''شخصیات نمبر'' سالنامہ ۱۹۶۹ء

سادگی پرست ہونے کے باوجود حاجنیؔ صاحب زبردست نفاست پسند تھے۔ اُن کی نفاست پسندی کا اندازہ اُن کے مکان کے طرزِ تعمیر اور اُس مکان کے سامنے بنائے گئے باغ سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ کھانے پینے کے معاملے میں حاجنیؔ سمجھو کہ عید کے دن پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں (بالغ ہونے کے بعد) شاید ہی کبھی گوشت کے بغیر کھانا کھایا ہوگا۔ لذت شناسی میں حاجنیؔ ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ تمبا کو پینا اُن کے عادات میں سے اہم تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی بھی اس سے پرہیز نہیں کیا۔ وہ دل کے عارضے میں مبتلا ہوئے تو ڈاکٹروں نے تمبا کو پینے پر پابندی لگادی۔ شوگر (Dibeties) کا مرض لاحق ہونے کے بعد بھی پیتے رہے۔ جب کبھی کوئی جرأت کر کے کچھ کہتا بھی تو کہتے کہ تمبا کو کو چھوڑنے سے نہ ہی کسی کی زندگی میں کمی ہوسکتی ہے اور پینے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔

پروفیسر حاجنیؔ صاف گو ہونے کے ساتھ ساتھ تیز مزاج اور حاضر جواب انسان تھے۔ اُنکی حاضر جوابی کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا جاچکا ہے۔ اُن کا اپروچ ہمیشہ حقیقت پسندانہ ہوتا تھا۔ اس لئے اُنہیں سمجھنے میں تھوڑا سا وقت ضرور لگتا تھا۔ اس بارے میں مرزا غلام حسن بیگ عارفؔ مرحوم رقمطراز ہیں۔

" It exhusted your patience to be his friend. He was so tough, rough, rustic and out spoken that it took quite some time to know the real humane, lovable Scholar behind his exterior."

تجسس، توکل، مہمان نوازی اور حاضر جوابی حاجنیؔ صاحب کی زندگی کے خاص خاص امتیازات تھے۔ وہ ہر قسم کے لوگوں کی باتیں دھیان لگا کر سنتے تھے اور اہم باتوں کو کشکول میں جمع کرتے تھے۔

حاجنیؔ صاحب نے کشمیری زبان کے کاز کو آگے لے جانے میں زبردست جگر کاوی کی۔ وہ اپنے جذبات، احساسات اور خیالات و مشاہدات کا اظہار اکثر اسی زبان میں کرتے

رہے۔ حاجنؔی صاحب نے کشمیری زبان کو یونیورسٹی، کالجوں اور اسکولوں کے نصاب میں شامل کرانے کیلئے جی توڑ محنت کی اور کشمیر یونیورسٹی کا ''کشمیری ڈیپارٹمنٹ'' اُن کی ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ حاجنؔی صاحب نے وادی کی مختلف ادبی انجمنوں کی داغ بیل ڈالی۔ ان انجمنوں میں ''ادبی مرکز کمراز سوپور'' حلقہ ادب سوناواری (حاجن)، ''کشمیر کلچرل آرگنائزیشن'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ حاجنی صاحب اور بھی بہت سارے اداروں اور انجمنوں کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ ریاستی کلچرل اکیڈمی کے ساتھ مختلف معاملات میں وابستہ رہے۔

پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ حاجنؔی صاحب تصنیف کے کاموں اور تنظیمی امور میں اتنے مصروف رہتے تھے کہ اپنی صحت کے بارے میں اُنہیں فکر کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ جس کی وجہ سے ۱۹۸۵ء میں اُنہیں بیماریوں نے اس طرح دبوچ لیا کہ حاجنؔی محض ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے۔ دل اور آنکھوں کی بیماری کے ساتھ اُنہیں شوگر (Diabities) کی بیماری بھی لاحق ہو چکی تھی۔ وہ چلنے پھرنے سے قاصر ہوگئے۔ پھر ۱۹۸۶ء میں ایک ایسی عجیب بات ہوگئی جس کا کسی کو اندازہ ہی نہ تھا۔ حاجن کی دھرتی پر پیدا ہونے والے اس قادرالکلام دانشور و مفکر، فصیح اللسان ادبی طوطے اور شگفتہ بیان عالمِ دین کی زبان بند ہوگئی۔ بقول سیکریٹری اوقاف حاجن۔

> ''شاید خدا کو اُن سے عالمِ برزخ میں واعظ تبلیغ کروانا تھا۔ شاید وہاں بہت ساری گھتیوں کو سلجھانا تھا۔ اسی لئے اس قادر الکلام اور حاضر جواب عالم کی زبان بند کر کے اس کی باتوں کو بچا کے رکھا۔''

رحمت حق ہونے تک حاجنؔی صاحب ایک زندہ لاش بن کر رہ گئے۔ آخر کار حاجن کے آسمان سے یہ خورشید ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ۱۴ ر جنوری ۱۹۹۳ء کو بروز سنیچر وار دن کے تین بجے

غروب ہو گیا۔[1] (انا للّٰہ و انا الیہ راجعون) لیکن اس آسمان پر ایسی چھاپ چھوڑ گیا۔ جو جہاں ایک طرف آنی والی نسلوں کیلئے مشعل راہ ہے وہی دوسری طرف اُن کی یاد قیامت کی صبح تک دلاتی رہے گی۔

جہلم کے کنارے کھلے ہوئے اس قدیم و جدید امتزاج کے پھول کو بالکل اپنے گھر کے صحن میں جہلم کے کنارے کے ساتھ ہی دفن کر دیا گیا۔ بے شک اُن کا جسم زمین کے اندر دفن ہو گیا مگر اُن کی روح آج بھی ہماری رہبری اور رہنمائی کر رہی ہے۔ حاجنیؔ تب تک زندہ و پایئندہ ہے جب تک روئے زمین پر ایک بھی کشمیری موجود ہے۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

فصل دوم

محقق و نقاد حاجنی

۱۔ کتاب الطواسین کے شارح پروفیسر حاجنی

۲۔ پروفیسر حاجنی کے وہاب

۳۔ کلامِ دیگرے

(الف) مولوی صدیق اللہ حاجنی

(ب) کشمیری زبان کے نثری لوک ادب کا خاکہ

(ج) علامہ اقبال اور حلاج

(د) آگ اور مرزا عارف کی ایک رباعی

پروفیسر محی الدین حاجنؔی کی ادبی خدمات

(اردو کے حوالے سے)

''حاجن'' کشمیر کے لسانی اور ادبی آسمان پر وہی اہمیت رکھتا ہے۔ جو اہمیت دُنیائے اُردو میں لکھنو یا دلی کو حاصل ہے۔ حاجن میں سینکڑوں سال تک ادبی روایات کو زندہ رکھنے والوں میں مولوی صدیق اللہ، وہاب پرے، اسد پرے، رمضان ڈار، لالہ تانترے، محمد کھار (شاہ گنڈ) پھر جدید دور میں کشمیر کی دھرتی کے عظیم سپوت، عربی کے عالم، اُردو اور انگریزی کے قلم کار اور کشمیری کے ہمدرد پروفیسر محی الدین حاجنؔی نے اس قدیم، عظیم اور مسلسل روایت کو آگے بڑھایا۔ عصرِ حاضر میں بھی حاجن اپنی روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ آج بھی کئی نامور قلمکار تخلیق، تحقیق اور تنقید کے میدان میں برسرِ پیکار ہیں۔

لیکن ان سینکڑوں سالوں میں حاجن میں جو سب سے بڑا اور اہم نام پیدا ہوا۔ وہ نام ہے۔ پروفیسر محی الدین حاجنؔی۔ جو پورے ملک میں ہی نہیں بلکہ سرحد کے پار بھی جانے جاتے ہیں۔ کشمیری زبان و ادب حاجنؔی کی مرہونِ منت ہے۔ انہوں نے کشمیری زبان کی ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی۔ حاجنؔی کشمیری میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کتابوں میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ یافتہ کتاب ''مقالات''، مشہور ترقی پسند ڈرامہ ''گریس سُند گرٕ''، مشہور داستان ''الف لیلیٰ'' کا کشمیری ترجمہ، کشمیری شاعری پر کتاب ''کاشرِ شاعری''

کاشرِ نثرچ کتاب، کوشُر ریڈر، وہاب پرے، ترجمۂ مسدس حالؔی، گاموشزی پھیری پھیری، لُکہٕ رس، ان کے علاوہ کئی شاعروں کے دیوان بھی مرتب کئے۔ ان مکمل تصنیفات کے علاوہ حاجنؔی صاحب نے کشمیری میں متعدد، تحقیقی، سائنسی، اور مذہبی مضامین لکھے ہیں۔

کشمیری میں حاجنؔی صاحب کس سہولیت سے قلم اٹھا سکتے تھے۔ اُس کا اندازہ اُن کی کثرتِ تصنیفات سے لگایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر حاجنؔی ایک ماہر ترجمہ کار بھی تھے۔ انہوں نے کئی مشہور کتابوں کے ترجمے کئے۔ ان میں شاعری، تصوف اور داستان شامل ہیں۔ شاعری کے میدان میں انہوں نے حالؔی کے ''مسدسِ حالؔی'' کا ترجمہ کیا۔ تصوف میں انہوں نے ''منصور حلاج'' کی کتاب کو عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اور مشہور داستان ''الف لیلیٰ'' کو بھی کشمیری میں ترجمہ کیا۔ مختصراً ترجمہ کاری میں بھی حاجنؔی وادی میں اور وادی کے باہر ایک نام اور مقام قائم کرچکے ہیں۔

پروفیسر حاجنؔی صاحب نے انگریزی میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ انہوں نے انگریزی میں کئی معرکتہ آرا مضامین لکھے ہیں۔ سال ۲۰۱۰ء میں اُن کے انگریزی مضامین کو حلقہ ادب سونا واری نے Discourses of Prof. Mohi U Din Hajin کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب میں مختلف سائنسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی موضوعات پر دس مضامین شامل ہیں۔ حالانکہ انہوں نے انگریزی میں تقریباً بیس سے زیادہ مضامین لکھے ہیں لیکن کوششوں کے باوجود بھی باقی مضامین کو ہم ڈھونڈ نہیں پائے۔ پروفیسر حاجنؔی کے فرزند محمد امین پرے نے ہمیں بتایا کہ انگریزی مضامین کی ایک فائل علی محمد اینڈ سنز کے پاس تھی۔ جنہوں نے اُن کو چھاپنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن پوچھے جانے پر انہوں نے اس ضمن میں اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا۔

زبان اُردو میں بھی پروفیسر حاجنؔی نے قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ وہ اُردو میں کئی

ا؎ اس ڈرامہ کو پروفیسر شفیع شوقؔ نے ترقی پسند ڈرامہ کہا ہے۔ بحوالہ بازیافت مطبوعہ شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۳

کتابوں اور بہت سارے مضامین کے مصنف ہیں۔ یہ کتاب اصل میں اُن کی اُردو تصنیفات وتخلیقات کا ایک مدلل جائزہ ہے۔ حالانکہ اردو میں اُن کی کوئی مکمل تصنیف موجود نہیں ہے۔ لیکن کئی ایک موضوعات پر انہوں نے تسلسل کے ساتھ لکھا اور کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جس موضوع پر انہوں نے تسلسل کے ساتھ اردو میں لکھا اس میں وہاب پرے حاجنیؔ کی شاعری کی مختلف جہتیں سرِ فہرست ہے۔ انہوں نے منصور کی شہرہ آفاق تصنیف "کتاب الطّواسین" کی تشریح کرکے اپنی عربی دانی کا لاہا منوایا۔

اب ہم پروفیسر حاجنیؔ صاحب کی اردو تصنیفات پر نظر ڈالتے ہوئے، ان کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

کتاب الطّواسین کے شارح

پروفیسر حاجنؔی

حاجنؔی صاحب بچپن سے ہی کافی ذہین اور محنتی طالبِ علم تھے۔ ان ہی خصوصیات کی بنیاد پر حاجن جیسے علاقے سے نکل کر وہ معاشی تنگدستی کے زمانے میں بھی علی گڑھ پہنچ گئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں حاجنؔی کا داخلہ ایم۔اے عربی کورس میں ہوا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں حاجنؔی صاحب اپنا زیادہ وقت کتب خانوں میں ہی گذارتے تھے۔ اپنی تعلیم کے دوران وہ زیادہ تر وقت یونیورسٹی کے لٹن کتب خانے میں گزارتے تھے۔ اس کتب خانہ کے مخطوطات شعبۂ میں جا کر کثرت سے مطالعہ بھی کرتے تھے۔ حاجنؔی صاحب نے علی گڑھ میں بہت جلد عربی زبان میں مہارت حاصل کی۔ منصور حلاؔج کے بارے میں حاجنؔی نے کہی نہ کہی کچھ نہ کچھ سنا ہی تھا۔ اسی لئے جب انہوں نے لٹن کتب خانے میں تیسری صدی ہجری کے جید صوفی منصور حلاج کی تصنیف ''کتاب الطّواسین'' دیکھی تو اُن کی دلچسپی اس تصنیف میں یکا یک پیدا ہوگئی اور انہوں نے اس کو پڑھنا شروع کیا۔ پڑھنے کے بعد انہوں نے ان اقوال کو نقل کیا۔ جب علی گڑھ سے فارغ ہو کر واپس آئے تو اُن اقوال کو اردو میں ترجمہ کیا۔ ان اقوال کو ترجمہ کرنے کے پسِ پردہ یہ نیت تھی کہ منصور حلاج کے بارے میں لوگوں میں ایک حقیقی جانکاری پھیلائی جائے۔ منصور کی زندگی کو یہاں کے لوگوں اور شعراء نے مفروضات اور جھوٹ کا پلندہ بنا دیا تھا۔ منصور کے بارے میں مُدیر رسالہ گلریز محمد امین بژؔھ لکھتے ہیں:۔

> ''ابا لمغیث حسین ابن علی المنصور الحلاج تیسری صدی ہجری میں دارالسلام بغداد میں پیدا ہوئے۔ اور ذی قعدہ ۳۰۹ھ میں تختہ دار پر چڑھائے گئے

اُن کے معتقدات نے ایک مذہبی انقلاب پیدا کر دیا۔ جس کے آثار آج تک ایرانی اور کشمیری ادب میں پائے جاتے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے اُن کی زندگی کو چیستاں بنا ڈالا [1]''

حقیقت بھی یہی ہے منصور کے بارے میں یہاں کے لوگوں نے بغیر جانے اور پڑھے وہ باتیں گڑھ لیں جن کا منصور کے ساتھ دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ کشمیر کے صوفی شاعروں نے منصور کو ایک دیو مالائی کردار کی صورت میں پیش کیا ہے۔ منصور کے بارے میں کسی شخص یا پھر عالموں کو جاننے کی نہ شاید ضرورت محسوس ہوئی اور نہ ہی فرصت ملی۔ مولانا جلال الدین رومیؒ جو ایک بلند پایہ صوفی بزرگ اور فارسی زبان کے بہت بڑے شاعر تھے، منصور حلاج کے ایک بہت بڑے معتقد تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ منصور حلاج کو چند غلط کار، تنگ نظر اور بے علم مذہبی عالموں کے غلط فیصلے کے نتیجے میں سولی پر چڑھایا گیا۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں۔

چوں قلم دردستِ غدارّے فتاد
لاجرم منصور برادرے فتاد

جب محی الدین حاجنیؔ کی نظر علی گڑھ یونیورسٹی کے لٹن کتب خانے میں تیسری صدی ہجری کی صوفیانہ شاہکار ''کتاب الطّواسین'' پر پڑی تو اُن کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ اس کتاب کی اُردو میں تشریح کی جائے۔ یوں بھی حاجنیؔ صاحب کو تصوف کے فلسفے پر اور بےجنل دسترس حاصل تھا۔ لیکن معاملہ یہ درپیش آیا کہ لٹن (LYTHON) کتب خانے کے اس شعبۂ میں کسی کو کاغذ اور پینسل ساتھ لے کر اندر جانے کی اجازت نہیں تھی، کسی مسودے کو باہر نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن حاجنیؔ علی گڑھ میں اس بات کا ارادہ کر چکے تھے کہ

---

[1] اداریہ ''گلریز'' جون ۱۹۵۳ء

اس کتاب کو ترجمہ کرنا ہی پڑے گا۔ اسلیئے وہ ہر دن اس کتب خانے میں جا کر، مسودے کے کچھ صفحات کا مطالعہ کرتے اور شام کو ہوسٹل میں جا کر اپنے ذہن کی مشق پر کنندہ الفاظ کو کاغذ پر اُتارتے۔ یہ سلسلہ ایک مہینے تک جاری رہا۔ اسطرح ایک مہینے میں ہی حاجن کے سپوت نے کتاب کی نقل مکمل کر لی۔[1]

کتاب کی نقل مکمل کرنے کے بعد وہ مرحلہ آیا جو نقل کے بعد ہر کتاب اور مصنف کو پیش آتا ہے۔ یعنی تقابل کا مرحلہ۔ اصلی اور نقلی مسودوں کا مقابلہ کر کے خامیوں اور کمیوں کو پورا کرنا تھا۔ لیکن اس کی کوئی راہ نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ اس لئے یہ بات چیف لائبریرین تک پہنچائی گئی۔ جب انہوں نے حاجنی کا نقل کیا ہوا مسودہ دیکھا تو وہ حاجنی صاحب کا قوتِ حافظہ دیکھ کر حیران ہو گئے۔ انہوں نے دونوں مسودوں کا مقابلہ کیا۔ اور صرف کچھ غلطیوں کو ٹھیک کر کے اُسے واپس حاجنی صاحب کو لوٹا دیا۔ اس واقعہ کے متعلق جسٹس غلام نبی گوہر خواجہ مبارک شاہ کا حوالہ دیکر رقمطراز ہیں۔

> ''منصور حلاج کی کتاب الطّواسین کی دُنیا بھر میں چند ہی نقلیں موجود تھیں۔ حاجنی نے اس کا مطالعہ کر کے اس کتاب کو حاصل کرنے کی خواہش کی، مگر کیسے حاصل کر لے۔ تو پھر از سر نو دس پندرہ صفحے پڑھ کر کمرے میں آ کر اتنا حصہ کاغذ پر اُتارا کرتے تھے۔ اس طرح سے کتاب کی نقل مکمل ہوئی۔ مگر مقابلہ کرے تو کیسے۔ آخر چیف لائبریرین صاحب نے ماجرا سُنا۔ انہوں نے نقل کا مقابلہ مسودہ کے ساتھ کر کے

---

[1] ''محی الدین حاجنی تاریخی حقیقت یا اساطیری عظمت'' از غلام نبی گوہر مطبوعہ وولر کی ملر حاجنی نمبر

آپکو یقین دے دیا، کہ ایک دو معمولی غلطیاں تھیں۔ اسی نقل کی بناء پر
آپ نے تصوف کے اس ماخذ رسالہ کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا۔"[1]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنی تعلیم (ایم۔اے۔عربی اور ایل۔ایل۔بی۔) مکمل کرنے کے بعد جب حاجنیؔ صاحب واپس کشمیر پہنچے۔ تو انہوں نے کتاب الطّواسین کے اُن اقوال کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ جن کی نقل انہوں نے علی گڑھ میں کی تھی۔ اور بعد میں اُس ترجمہ کو رسالہ گلریز کے اگست، نومبر، دسمبر ۱۹۵۳ء اور فروری اور اگست ۱۹۵۴ء کے شماروں میں قسط وار شائع کیا گیا۔ اصل میں حاجنیؔ صاحب نے کتاب الطّواسین کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ اُنہوں نے پہلے اس کتاب پر ایک سرسری تبصرہ کیا اور بعد میں اس کے کچھ اقوال کی تشریح کی۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں رسالہ گلریز میں اس کی پہلی قسط شائع ہوئی۔ حاجنیؔ صاحب کتاب الطّواسین کے متعلق رقمطراز ہیں۔

> "کتاب الطّواسین کے اندازِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ منصور نے خود یہ کتاب نہیں لکھی ہے۔ بلکہ یہ منصور کے اُن اقوال کا مجموعہ ہے۔ جو اُس نے عالمِ وجد میں کہے ہیں اور اس کے مریدوں نے جمع کر کے ان کو کتابی صورت میں قلم بند کر دیا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، پوری کتاب کا مربوط المضامین ہونا تو درکنار، ہر ایک طس میں مختلف اقوال الگ الگ نمبر وار درج ہیں۔ جو ایک باارادہ مصنف کا طریقہ تصنیف نہیں۔"

جب کتاب الطّواسین کی پہلی قسط جولائی ۱۹۵۳ء میں گلریز میں "طاسین السراج" کے عنوان سے چھپی۔ تو اہل علم و دانش نے حاجنیؔ کے اس کارنامہ کو سراہا۔ پھر جب دوبارہ یہی قسط اگست ۱۹۵۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد امین بٹ ؔ نے

---

[1] حاجنیؔ ایک متحرک دار المعارف" از غلام نبی گوہرؔ مطبوعہ بازیافت شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۳ء

گلریز کے اداریہ میں ایک طرف اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے اور دوسری طرف حاجنؔی صاحب کو جوش دلانے کیلئے یوں کہا۔

''اس شمارے میں سب سے پہلے ادارہ ''گلریز'' کی طرف سے منصور حلاج پر ایک مختصر سا تعارفی مضمون لکھا گیا ہے جس میں اعلان کیا گیا ہے۔ کہ منصور کے اقوال کا مجموعہ کتاب الطّواسین ادارہ کے ہاتھ لگا ہے۔ جس کے عربی متن کو اردو شرح و تفسیر کے ساتھ گل ریز میں بہ اقساط شائع کیا جائے گا۔ تشنگانِ علمی کیلئے یہ خبر انتہائی فرحت اثر ہے۔ برصغیر ہند میں اُردو داں طبقہ اس مجموعہ کے اقوال اور ان کی اردو تشریح و ترجمہ کیلئے چشم براہ رہے گا۔ منصور حلاج کی شخصیت ابھی پردہ راز میں ہے اور اہلِ تصوف کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔ عام تعلیم یافتہ طبقہ کو اتنا ہی معلوم ہے کہ منصورؔ نے ''انا الحق'' کا نعرہ دیا اور وہ سولی پر چڑھائے گئے۔ گو علامہ اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں حلاج کی شخصیت کا اہل علم وفکر سے تعارف کرایا۔ مگر پھر بھی اس بات کا انتظار کیا جارہا ہے کہ اس وقیع المرتبت صوفی کے اقوال سے اس کی شخصیت اجاگر کی جائے۔ تاکہ منصوریت کو سمجھنے میں کماحقہ آسانی ہو۔

ادارہ گلریز کے سرگرم اور قابل رکن پروفیسر محمد الدین حاجنؔی اگر ان اقوال کی تشریح کرنے کا بیڑا اُٹھائیں تو کشمیر کے اہل علم اُن کے مرہونِ

منت بنیں گے۔ کیونکہ حلاج کے اقوال کی تفسیر لکھنا اُن ہی کا کام ہوسکتا ہے۔"[1]

بزم ادب کشمیر کے ارکان و عہدیداراں کو اس بات کا بھروسہ تھا کہ اگر پروفیسر محی الدین حاجنی نے رسالہ "گلریز" کو اپنے قلم کی روشنائی سے روشن کیا۔ تو اس رسالہ کی روشنی بہت دور تک پھیل جائے گی۔ خصوصاً اگر وہ منصور کے اقوال کی تفسیر اس رسالہ میں جاری رکھیں گے تو اہل فکر و دانش کی نظروں میں اس رسالے کی وقعت بہت بڑھ جائے گی۔ کشمیر چونکہ صوفی فکر اور عمل کا ایک بہت بڑا مرکز رہا ہے اسلیئے یہاں کا لوگوں کو منصور کے ساتھ عقیدت کا رشتہ تھا۔ اسی وجہ سے حاجنی صاحب کے اس کام کو لیکر گلریز سے وابستہ سبھی لوگ خوش بھی تھے اور جذباتی بھی۔ ان باتوں کا اعتراف محمد امین بڑھ جولائی ۱۹۵۳ء کے شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے کرتے ہیں۔

> "اگر منصور کے اقوال کی تشریح کا سلسلہ مضامین رسالہ گلریز میں شائع ہوتا رہا تو یہ رسالہ علمی دنیا کے اونچے پایہ کے علمی رسائل میں شمار ہو سکے گا۔ کتاب الطّواسین کا صرف فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔"

منصور حلاج کے اقوال کا جہاں تک تعلق ہے۔ اُس کے مریدوں نے اُنکو جمع کر کے کتابی شکل دی۔ پروفیسر محی الدین حاجنی نے اُن اقوال کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لٹن کتب خانے سے حاصل کر کے اُنکی تفسیر کی۔ جسکو پڑھ کر اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ منصور عشق محمدیؐ میں ڈوبا ہوا شمع رسالتؐ کا پروانہ تھا۔ جس نے عشقِ محمدیؐ کی حقیقت کو جان لیا تھا۔ وہ اویسی فکر سے روشنی حاصل کر کے دنیاداری و دنیاوی بندشوں اور معاملات سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

---

[1] ماہنامہ "گلریز" اگست ۱۹۵۳ء

پروفیسر حاجنی کے مضامین کو پڑھ کر اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، کہ منصور حلاج عشق وعرفاں کا سرمست دُنیا جہاں سے بے خبر دن رات عالم وجد میں رہا کرتا تھا۔ دنیا پرست عالموں اور ریا کاروں نے اُس کے جذبہ عشق کو بغیر سمجھے اس کی عرفانی سوچ اور صحیح باتوں پر اُسے ملحد اور زندیق کہہ کر اُس سے بے عمل اور ظالم قانون کے ہاتھوں سولی پر چڑھوایا۔ قانونِ وقت کو نافذ کرنے والے بے روح حکمران اس بات سے نابلد تھے کہ عشق اور علم کی منزل اصل میں قربِ الٰہی اور اللہ کو پہچاننا ہے۔ لیکن اس مقام کو حاصل کرنے کیلئے یا اس مقام تک پہنچنے کیلئے ان کے راستے الگ الگ ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ عشق نے کبھی نتائج کی پرواہ نہیں کی ہے جبکہ علم ہمیشہ نتائج کو دیکھتا ہے۔ یہی فرق کاروبارِ دنیا چلانے والے لوگوں کو عشق سے بیزار کرتی ہے۔ اس صداقت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ جہاں عشق و عرفان ایک ہی جست میں تمام فاصلے طے کرتا ہے وہاں علم کو پہنچنے میں صدیاں لگتی ہیں۔ جو بات عشق آج سے ہزاروں سال پہلے جانتا تھا۔ وہ آج بھی شاید علم کو پتہ اور معلوم نہیں۔ اسی وجہ سے دنیا پرست عالم عشق کے معاملات میں ہمیشہ غلط فیصلے صادر کرتے رہتے ہیں۔ وہ عشق وعرفاں کو علم کا رقیب سمجھتے ہیں جو کہ سراسر اُن کا علمی، عقلی اور استدلالی دھوکہ ہے۔ حقیقت میں علم اور عشق ایک ہی سوتے سے پھوٹی دوندیاں ہیں اور ایک ہی سمندر کی اور بہنے والے دو دریا ہیں۔ علم وعرفان کے رشتے کی حقیقت کا اظہار حکیم الامت علامہ سر محمد اقبال بڑے خوبصورت پیرائے میں اس کمال یقین کے ساتھ کرتا ہے۔

رقابت علم وعرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاج کی سُولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

پروفیسر محی الدین حاجنی نے ''کتاب الطّواسین'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان سارے

حقائق کے ساتھ مدلل بحث کی ہے۔ انہوں نے تصوف، عرفان، عشق اور علم کے درمیان تمام ممکنہ رشتوں اور رنجشوں پر عالمانہ اور سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ حاجنؔی صاحب کے اس کارنامہ پر تبصرہ کرتے کشمیر بزم ادب کے رکن محمد بٹؔھ لکھتے ہیں۔

''منصور کے اقوال کی عالمانہ تفسیر وتشریح لکھ کر پروفیسر موصوف نے ایک ایسا لطیف قصہ چھیڑا ہے۔ جس سے فی الواقع گل ریز کا رتبہ بلند ہو گیا ہے۔ اب یہ بات بلا کسی تردید کے کہی جا سکتی ہے۔ کہ منصوریت کو سمجھنے کیلئے پیرس یونیورسٹی کی لائبریری (جہاں کتاب الطّواسین کا فرانسیسی ترجمہ پروفیسر لوئی مینسن کا کیا ہوا موجود ہے) جامعہ استنبول کا کتب خانہ (جہاں کتاب الطّواسین کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے) اور رسالۂ گلریز (جس میں ان اقوال کی تشریح وتفسیر ہو رہی ہے) کی فائیل یکساں طور پر کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔''[1]

اس طرح پروفیسر محی الدین حاجنؔی نے عربی زبان کی ایک بلند قامت اور ہنگامہ خیز شخصیت کے اقوال کا ترجمہ اور تفسیر کر کے، جہاں ایک طرف اُردو ادب کے میدانِ تصوف میں اضافہ کیا وہی دوسری اور رسالہ گلریز کا مقام بھی بلند کر دیا۔ ان اقوال کی تفسیر وترجمہ کرنے کا بیڑا اٹھا کر حاجنؔی نے ایک عظیم علمی، فکری، فلسفی اور صوفی ترانہ چھیڑا تھا۔ مگر ناداری قسمت یہ کہ حاجنؔی لااُبالی طبیعت کے مالک انسان تھے۔ جو من میں آیا وہ کیا۔ کبھی کوئی قصہ چھیڑا تو کبھی کوئی۔ یکسوئی کے ساتھ کسی ایک چیز سے من نہیں لگاتے تھے۔ دوسرا کشمیری زبان و ثقافت کی فکر سے وہ دوسرے کاموں میں جی لگا ہی نہیں پاتے تھے۔ اگر اُنہوں نے ''کتاب الطّواسین'' کی تفسیر کا کام مکمل کیا ہوتا تو یہ اُن کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوتا۔ لیکن دیگر مصروفیات کی وجہ سے وہ یہ کام مکمل نہیں کر سکے۔ ایک اور چیز کی طرف اشارہ کرنا ضروری

---

[1] ماہنامہ ''گلریز'' سالنامہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۳ء

سمجھتا ہوں کہ حاجنیؔ صاحب نے بہت زیادہ لکھا ہے۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور سب سے زیادہ کشمیری زبان میں۔ انہوں نے کسی ایک موضوع پر یکسوئی کے ساتھ قلم نہیں اٹھایا، بلکہ متنوع موضوعات کو اپنی قلم کی جولانی سے دوام بخشا۔ وہ ڈرامہ بھی لکھے ہیں اور شاعری بھی۔ تنقید میں زور آزمائی کی ہے اور تحقیق میں بھی۔ سائنسی گتھیاں بھی سلجھائی ہے اور سماجی معاملات کی گرہیں بھی کھولیں ہیں۔ انہوں نے ادب کے گیسو بھی سنوارے ہیں اور تاریخ پر بھی تازیانہ لکھا ہے۔ جب کوئی شخص اتنا لکھتا ہے تو پھر اپنے لکھے ہوئے کو سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ شاید ایسا ہی کتاب الطّواسین کے ساتھ بھی ہوا ہو۔ اس کے باوجود بھی اہل علم اور ادب نواز لوگوں کی چیرادستی دیکھئے کہ جو تفسیر و ترجمہ اُنہوں نے کیا، اُس کو ابھی تک کتابی شکل میں شائع نہیں کیا گیا۔

جہاں تک اس تفسیر کے اسلوب کا تعلق ہے اس کی زبان خواص پسند ہے۔ حاجنیؔ صاحب نے صاف، شستہ اور خالص ادبی زبان کا استعمال کیا ہے۔ اُن کا یہ کارنامہ دیکھ کر اُنکی ناقدانہ بصیرت، محققانہ نظر اور عالمانہ قوت کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور اُن کے علمی قد و قامت کا اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے۔

پروفیسر حاجنؔی کے وہابؔ

حاجن کشمیری زبان کا گلستانِ ادب ہے۔ جن پھولوں کی مہک سے کشمیر اور کشمیری زبان کی کائنات مہک رہی ہے اُن پھولوں میں کئی پھول اسی حاجن کے گلستانِ ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے ہی پھولوں میں ایک پھول عبدالوہاب پرے حاجنؔی ہے۔ وہاب پرے حاجنؔی کشمیری زبان کے ایک بسیار گو شاعر ہے۔ جس ماحول میں وہاب نے آنکھیں کھولیں اور اپنے شعور کو پہنچ گئے، وہ کشمیری شاعری کے شباب کا ابتدائی زمانہ تھا۔ وہ رحیؔم صاحب، نعمہ صاحب، محمود گامی، پرمانند، مقبول کرالہ وارؔی اور رحمان ڈار جیسے شاعروں کے جانشین ہونے کے علاوہ، رسول میر، وہاب کھار، لکشمن بلبلؔ، شمسؔ فقیر اور احمد بٹواری جیسے بلند پایہ شاعروں کے ہم عصر ہیں۔

جہاں کشمیری زبان کے دوسرے شاعر اپنی جوانی ہی میں وادی اور وادی کے باہر مشہور ہوئے۔ وہاں وہاب پرؔے اپنے بڑھاپے میں بھی لوگوں تک پہنچ نہیں سکے۔ حالانکہ حاجن اور اس کے ملحقہ علاقوں میں لوگ وہاب پرؔے اور اس کی شاعری سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے گرویدہ تھے۔ لوگ اُن کی شاعری مختلف سماجی اور دوسرے موقعوں پر گاتے تھے۔ شادی بیاہ اور کاشتکاری کے دوران اُن کی شاعری کی ہر طرف دھوم ہوتی تھی۔ لیکن ان علاقوں سے باہر انہیں شاید ہی کوئی جانتا تھا۔ اُنہیں کشمیر اور کشمیری ادب نوازوں کے سامنے متعارف ہونے کیلئے تقریباً اپنی موت کے بعد پچاس سال کا انتظار کرنا پڑا۔ یہ پروفیسر محی الدین حاجنؔی ہی تھے جنہوں نے وہاب پرے حاجنؔی کو کشمیریوں کے سامنے متعارف کرنے

کے ساتھ ساتھ اُن کی ادبی عظمت کا سکہ بھی جما دیا۔

ابھی رسالہ ''گلریز'' اپنے ابتدائی مراحل ہی طے کر رہا تھا کہ اس کے دسمبر ۱۹۵۲ء کے شمارے میں پروفیسر حاجنیؔ کا مضمون ''کشمیر کا فردوسی۔ وہاب پرے'' شائع ہوا۔ یہ مضمون وہاب پرے کے متعلق ایک تعارفی مضمون تھا۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجنیؔ نے وہاب پرے کی زندگی کے مختلف گوشوں پر عالمانہ اور محققانہ بصیرت کے ساتھ روشنی ڈالی۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہاب پرے کی زندگی کے متعلق کسی محقق نے قلم اٹھایا۔ اس مضمون سے جہاں قارئین ''گلریز'' کو وہاب پرے کے متعلق جانکاری حاصل ہوئی۔ وہی اُنہیں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ پروفیسر محی الدین حاجنیؔ صرف ایک اُستاد ہی نہیں بلکہ ایک منجھے ہوئے محقق اور ایک باریک بین نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ علم وادب کے بہت بڑے مزاج شناس بھی ہے۔ رسالہ ''گلریز'' کے ساتھ منسلک ہونے کے بعد پروفیسر حاجنیؔ نے وہاب پرےؔ کے ادبی کارناموں سے لوگوں کو اسطرح روشناس کیا۔ کہ اُن پر وہاب پرے کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا۔ رسالہ گلریز کے مختلف شماروں میں پروفیسر حاجنیؔ کے جو مضامین وہاب پرےؔ کی زندگی اور اُن کے ادبی کارناموں کے متعلق شائع ہوئے۔ اُن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔	'فردوسی کشمیر۔ وہاب پرےؔ	ماہنامہ گلریز دسمبر ۱۹۵۲ء
۲۔	کشمیر کا فردوسی۔ ادب کی دنیا میں	گلریز مارچ واپریل ۱۹۵۳ء
۳۔	وہابؔ۔ فردوسی ایران کی دُنیا میں	گلریز سالنامہ ستمبر واکتوبر ۱۹۵۳ء
۴۔	کشمیر کا فردوسی۔ تصوف کی دنیا میں	ماہنامہ گلریز مئی ۱۹۵۳ء
۵۔	وہاب۔ بحیثیت مورخِ کشمیر	ماہنامہ گلریز مارچ ۱۹۵۴ء

ان مضامین نے وہاب پرے کو زمانہ کی گمنامیوں سے نکال کر کشمیر کے بلند پایہ شاعروں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ وہاب پرے، جس کو محی الدین حاجنیؔ کے سرینگر ایس۔ پی۔ کالج تبدیل ہونے تک کوئی نہیں جانتا تھا، پروفیسر حاجنیؔ کی بدولت ایران پہنچ کر لافانی بن گئے۔ پروفیسر حاجنیؔ کے مضامین نے وہابؔ پرے کو زمانے کے دھندلکوں سے نکال کر کشمیر کے گھر گھر تک پہنچانے کے ساتھ ہی فارسی زبان کے عظیم شاعر فردوسیؔ کے مقابل بھی کھڑا کر دیا۔ اس طرح وہاب پرےؔ کی شاعرانہ شخصیت کے متعلق کشمیر کے اہلِ ذوق، شعر فہم اور کشمیری زبان کے خیر خواہ قبیلے کو نہ صرف جانکاری حاصل ہوئی بلکہ اُن کی شاعرانہ عظمت کا بھی اُن کو اندازہ ہو گیا۔

پروفیسر محی الدین حاجنیؔ نے وہاب پرےؔ کے متعلق پہلا مضمون ''فردوسیِ کشمیر۔ وہابؔ پرے'' کے عنوان سے لکھا۔ اس میں وہاب پرےؔ کے حالاتِ زندگی پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجنیؔ اُن حالات کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں جن حالات میں وہاب پرے حاجن میں پیدا ہوئے۔ وہاب حاجنیؔ کے حالات زندگی کی آڑ میں پروفیسر حاجنیؔ بیعہ نامہ امرتسر اور اس دور میں کشمیریوں پر کئے جا رہے ظلم و جبر کی داستان کھلم کھلا اور درد و کسک کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ کشمیریوں کی غریبی، بے چارگی اور مظلومیت کا بیان اس انداز سے کرتے ہیں۔

> ''وادی کشمیر کے دور افتادہ دیہات میں ابھی یہ حسرتناک خبر سنائی نہیں گئی تھی کہ سکھوں کی ستائیس سالہ ''سکھ شاہی'' کا خاتمہ ۱۵ ربیع الاول ۱۲۶۲ھ کو بیعہ نامہ امرتسر کے سوئا البدل سے ہو چکا ہے۔ ابھی ایک کشمیری کی زندگی کا معاوضہ بیس نانک شاہی روپیہ سے گھٹ کر اڑھائی

روپیہ ضرب شاہی تک نہیں پہنچا تھا۔ ابھی پوری وادی پر استبدار، لوٹ اور عصمت دری کے کارندے کالی گھٹاؤں کی صورت میں چھائے ہی ہوئے تھے۔ ہر جگہ افلاس، بے چارگی، مظلومیت اور احساس کمتری کے بھیانک مناظر ابھی تاریخ کشمیر میں بدنما ترین شواہد کا اضافہ کر رہے تھے کہ اسی پر آشوب اور درد انگیز سال میں عبدالوہاب پرے جو کہ اپنے شعری کارناموں میں صرف وہاب تخلص کرتے تھے۔ ۱۴/ ماہ شعبان ۱۲۶۲ ہجری کو سوموار کے دن تحصیل سوناواری کے ایک گاؤں حاجن میں کتم عدم سے منصبِ شہود پر جلوہ گر ہوئے"۔[1]

پروفیسر حاجنی نے وہاب پرے کی زندگی کے بارے میں معلومات جمع کرتے ہوئے نہایت احتیاط سے کام لیا۔ وہ جانتے تھے کہ ایسی شخصیات کی زندگیوں کو لوگ عقیدت یا لاعلمی کی وجہ سے اساطیری بنا دیتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے وہاب کی زندگی کے بارے میں معلومات جمع کرتے ہوئے کسی قسم کے مبالغے یا غلو سے احتراز کیا۔ وہاب کے ہم عمر بزرگ لوگوں سے اس کی زندگی کے بارنے میں ایک ایک بات کرید کرید کر ہمارے سامنے رکھی۔ اس سوانحی مضمون کو لکھنے کے دوران پروفیسر حاجنی ایک سچے اور دیانتدار محقق بن کر اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔

وہاب پرے کے حالات زندگی بیان کرنے کے بعد پروفیسر حاجنی نے اُن کو اہل علم و ادب کے سامنے ایک باوقار اور ہمہ جہت ادیب کی حیثیت سے پیش کیا۔ "کشمیر کا فردوسی۔ ادب کی دُنیا میں" مضمون لکھ کر انہوں نے وہاب پرے کے ادبی کارناموں، اسکی مختلف ادبی

---

[1] ماہنامہ "گلریز" دسمبر ۱۹۵۲ء

جہات اور موضوعات کو موضوعِ بحث بنایا۔ یہ مضمون گلریز کے مارچ اور اپریل ۱۹۵۳ء کے دو شماروں میں قسط وار شائع ہوا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہاب پرے بسیار نویسی میں کشمیری زبان کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ انہوں نے لکھا اور بہت لکھا۔ متنوع موضوعات کو اپنے قلم کی جولانیوں سے روشن کیا۔ شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر انہوں نے قلم آزمائی نہ کی ہو، لیکن دنیا کی ناپائیداری اور سماجی معاملات کی آنا کانی اس کے محبوب موضوعات رہے ہیں۔ جب کوئی شاعر بہت زیادہ لکھتا ہے تو معیار کبھی کبھار مقدار کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاب کے یہاں صرف مقدار (quantity) ہے اور معیار (quality) نہیں۔ بلکہ اُنکے یہاں اعلیٰ پایہ کی شاعری بھی موجود ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عام وخواص وہاب پرے کے کارناموں سے بے خبر تھے۔ پروفیسر حاجنیؔ نے اُن کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ اُن کا دبدبہ کشمیری شاعری میں قائم ہوا۔ پروفیسر حاجنیؔ نے وہابؔ پرے کو متعارف کرانے میں وہی کام کیا جو کام مولانا حالیؔ نے غالبؔ اور اُن کے شعری کارناموں کو منظر عام پر لانے کیلئے کیا ہے۔ مضمون کے آغاز میں وہابؔ کے ادبی قد کا دبدبہ قائم کرتے ہوئے پروفیسر حاجنیؔ اُن کے دستیاب اور عدم دستیاب کلام کی بات چھیڑتے ہی اُن کی ادبی عظمت کا سکہ بٹھا دیتے ہیں۔

"وہاب کے ادبی شاہکاروں کا نقد وتبصرہ ایک مختصر مضمون میں کرنا ناممکن ہے کیونکہ دیوانِ وہابؔ سے قطع نظر صرف اُن تواریخی اور تالیفی اشعار کی تعداد جو زمانے کی دست برد سے بچ گئے ہیں ۴۵ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ ان کے علاوہ نونہال، گل بدن ہفت قصۂ غمی، ہفت قصۂ مکرزن، قصۂ چار درویش اور بے بوج نامہ وغیرہ اُن کی تخلیقات ہیں جو دستیاب نہ ہونے کے سبب تنقیدی بحث

سے خارج رکھنا پڑیں گی۔ اگر صرف دیوانِ وہابؔ کی تنقید مدنظر ہو۔ تو یہاں تیس ردیفوں میں لکھی ہوئی سات سو اکیاسی (۷۸۱) منظومات ہیں۔ جو زندگی کے ہر شعبے سے متعلق کچھ نہ کچھ مواد فراہم کرتی ہیں۔ اور جو تمام اضاف سخن میں کلاسیکی صنائع و بدائع کا ایک ایسا دل ربا رقع ہے۔ جو اختصار پسند نقاد کو بھی، بسیار نویسی کی طرف مائل کرے اور جس کی ادبیت کے چند امتیازی نقوش اور حد بندی کی نمایاں لائینوں کو کھینچتے ہوئے بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہابؔ کے ساتھ بے انصافی ہو رہی ہے۔"[1]

وہاب پرے کو فارسی زبان و ادب کا گہرا مطالعہ تھا۔ وہ فارسی شاعری کی مختلف ہیئتوں، اصطلاحات اور دیگر شعری نزاکتوں سے بھی واقف تھے۔ اُس کے ہم عصر شعراء و ادیب کشمیری شاعری میں فارسی الفاظ و تراکیب کو ٹھونسا فیشن سمجھتے تھے۔ وہابؔ نے بھی اس روایت کی پیروی کرتے ہوئے اپنی ابتدائی شاعری میں فارسی زبان کو کشمیری کلام میں سجا کر اپنی شاعری کو حُسن بخشا ہے۔ لیکن آگے چل کر وہابؔ اس فیشن پرستی سے منھ موڑ کر خالص کشمیری زبان کا استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہابؔ پرے کے لسانی برتاو کے بارے میں بات کرتے ہوئے پروفیسر حاجنیؔ رقمطراز ہیں۔

> "اس زمانے میں جبکہ فارسی کو کشمیری میں جا بیجا ٹھونسنا فیشن میں شمار ہوتا تھا۔ وہاب اس لسانی نظام پیوند سے اپنے ابتدائی کلام میں بھی ایک ایسا لطیف اور دل آویز امتزاج پیدا کرتا ہے۔ جس میں فارسیت بتدریج کشمیریت میں مدغم ہوتی جاتی ہے۔"[2]

پروفیسر حاجنیؔ نے اس مضمون میں وہابؔ پرے کی شاعری کے موضوعات، اُنکے انداز بیان، مختلف شعری صنعتوں کے استعمال اور دیگر شعری اور فنی محاسن کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

---

[1] ، [2] ماہنامہ گلریز مارچ ۱۹۵۳ء

پروفیسر حاجنیؔ نے وہابؔ کی شعری زمینوں کو الگ الگ کر کے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ایک بات اہم ہے کہ حاجنی صاحبؔ نے تفصیل کے ساتھ وہابؔ کے فنی محاسن پر بات نہیں کی ہے۔ بلکہ سرسری طور سے ہر چیز کی جھلک سی دکھا کر آگے بڑھتے ہیں۔ وہابؔ کے عشقیہ کلام پر بات کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''وہاب کے عشقیہ کلام میں نہ سبکی نظر آتی ہے نہ شہوانی ہیجان، نہ سفلہ پن ملتا ہے اور نہ جذباتی سفاہت۔ ہاں زمانہ کی بسیط اور آفاقی نیرنگیوں کے گہرے مشاہدے سے وہابؔ اپنی ''ہیچ مدانی'' کو بار بار محسوس کرتا ہے اور یہ احساس علی العموم خوف زدگی یا احساسِ کمتری کی صورت اختیار کرتا ہے۔''[1]

کبھی کبھار کچھ اشعار پر حاجنیؔ صاحب کا تبصرہ پڑھ کر قاری شاعر کو بھول کر ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ شعر فہمی ایک بہت بڑا گن ہے اور یہ سب میں نہیں ہوتا ہے۔ حاجنیؔ صاحب غضب کے شعر شناس اور شعر فہم تھے۔ جس کا برملا ثبوت انہوں نے وہابؔ کے اشعار کے نقد و تبصرے کے دوران کیا۔ انہوں نے وہابؔ کے اشعار کو ایسے جامے پہنائے کہ شاید ہی کبھی شاعر نے بھی سوچا ہو۔ اشعار میں معنوی امکانات تلاش کرنا تو ایک بات ہے لیکن حاجنیؔ صاحب وہابؔ کے اشعار کی معنوی جہات ٹٹولتے ٹٹولتے ایک نیا جہانِ معنی پیدا کر دیتے ہیں۔ پروفیسر حاجنیؔ کو نفسیات کے علم سے بھی گہرا شغف تھا۔ وہابؔ کے اشعار کی تشریح کرتے ہوئے وہ نفسیاتی گرہیں بھی کھول دیتے ہیں۔

''تحت الشعوری حدت شعور میں علی العموم تضاد پسندی کا سلیقہ پیدا کرتی ہے اور بلوغ نظر یا حقیقی ادبیت کا کمال یہ ہے کہ اس مقام پر شاعر جذبات کی رو میں بہہ جانے کے بجائے متضاد عناصر کو یوں ہم آہنگ کرے کہ سننے والے کو شاعر کے ذہنی تلاطم کا پتہ ہی نہ چلے اور وہ اپنے ذہنی محور کو بھی شاعر کے مدار پر ہی

---

[1] ماہنامہ گلریز مارچ ۱۹۵۴ء

گامزن محسوس کر سکے''[1]

ان مضامین میں پروفیسر حاجنیؔ نے وہابؔ کی شاعری کی خوبیوں کو ایک ایک کر کے گنا۔ خوبیوں کو بیان کرتے کرتے پروفیسر حاجنیؔ صاحب ایک غیر جانبدار نقاد کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآں ہونے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ وہ کہیں بھی وہابؔ کی کسی ایک شاعرانہ خامی یا نقص کا تذکرہ نہیں کرتے ہیں۔

''وہابؔ کے مشکل ردیف مشکل تر قافیہ کے متقاضی ہیں۔ لیکن کاوشِ فکر کی کامیابی اور شگفتگیٔ بیان دیکھئے کہ دشوار گذار زمینوں میں بھی وہابؔ ''خوش رفتار'' رہا اور جہاں جہاں سخن وری کے لوازم شدید صورت اختیار کرنے لگے، وہابؔ گھبرانے کے بجائے ایسی نادر مرصع کاری کرنے لگا کہ ہر لفظ پوری بندش سے چُست، ہر خیال بے تکلفانہ آمد کا آیئنہ دار اور ہر قافیہ بولتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔''[2]

وہابؔ کے ساتھ یہ پروفیسر حاجنیؔ کی عقیدت کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ اس کی شاعری کی خوبیاں بیان کرتے کرتے اس کی خامیوں سے صرفِ نظر کر گئے۔ یہ خالص عقیدت مندی تھی باقی کچھ نہیں۔

وہاب پرے کا سب سے بڑا کارنامہ ''فردوسی'' کے ''شاہنامہ'' کا کشمیری ترجمہ ہے۔ وہاب نے ''شاہنامہ'' کا ترجمہ کسی تحریک یا محبت کی بنیاد پر نہیں کیا بلکہ انہوں نے یہ کام انتہائی غصہ میں انجام دیا۔ اس واقعہ کی تفصیل حاجنیؔ صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''حاجن کا ایک مولوی زادہ قاضی غلام رسول پنجاب کی سیاحت کے دوران میں اس کا ایک نسخہ خرید کر لایا۔ اور وہابؔ نے ۱۲۹۷ھ سے پہلے پہلے کسی دوست کی وساطت سے شاہنامہ کا یہ نسخہ دیکھا۔ قاضی صاحب نے زیادہ دیر

---

[1] ماہنامہ ''گلریز'' اپریل ۱۹۵۳ء

مطالعہ کی مہلت نہ بخشی اور اپنے کسی رشتہ دار کے ذریعہ اشتعال انگیز لہجہ میں پیغام بیج دیا کہ ''شاہنامہ واپس کرو۔۔۔۔یہ مجھے مثنوی سے بھی زیادہ عزیز ہے'' اس پیغام کے سننے کی دیر تھی کہ وہاب برفروختہ ہو گیا اور گویا ہوا۔''[1]

اس ترجمہ میں ترجمہ کی جگہ تخلیق کی شان جھلکتی ہے۔ وہابؔ پرے کے اس کارنامہ سے متاثر ہو کر ہی پروفیسر حاجنی نے وہاب پرے کو ''کشمیر کا فردوسی'' قرار دیا ہے۔ حاجنی صاحب کا اور ایک مضمون گلریز میں ''وہابؔ۔ فردوسیِ ایران کی دُنیا میں'' کے عنوان سے سالنامہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۳ء میں چھپا۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجنیؔ وہابؔ پرے اور فردوسی کے حالاتِ زندگی کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے وہابؔ کو ایک خوش بخت ادیب قرار دیتے ہیں۔ وہ وہابؔ کی زندگی کے متعلق لوگوں کی ناواقفیت اور عدم دلچسپی کو ہی اس کی خوش قسمتی مانتا ہے۔ جبکہ فردوسیؔ سے متعلق جانکاری کی افراط و تفریط کو اس کی بدقسمتی بتاتا ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ فردوسی کے متعلق جس تذکرہ نگار کے من میں جو آیا۔ لکھ ڈالا۔ یہاں تک کہ ان کی ولدیت، سکونت اور تاریخ ولادت میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔ حد تو یہ ہے کہ یہ اختلاف فردوسی کے حالاتِ زندگی تک ہی محدود نہ رہا بلکہ فردوسی کے شاہکار ''شاہنامہ'' میں بھی اُن کے جانشینوں نے کھل بھلی کی۔ اسی وجہ سے شاہنامہ کی صحیح ابیات آج تک معلوم نہیں ہوسکی۔ پروفیسر حاجنیؔ ان سبھی باتوں کو مدنظر رکھ کر فردوسی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''سوانح نگاروں کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ فردوسیؔ ایران کے نام، ولدیت، سکونت اور تاریخ ولادت میں بھی اختلاف پیدا کر دیا، تاریخ گزیدہ میں نام

---

[1] گلریز سالنامہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۳ء

حسن بن علی، دولت شاہ کے ہاں نام حسن بن اسحاق، دیباچہ بایسنغری میں منصور احمد اور پروفیسر شیرانؔی کے نزدیک ابوالقاسم المنصور الفردوسی۔ جائے ولادت بعض کے نزدیک شاداب اور بعض کے نزدیک ''باژ'' جو ناحیہ طبران میں واقع تھا۔ اور طبران پرگنہ طوس کا ایک شہر تھا۔ ولادت کی تاریخ کے متعلق علامہ شبلی مرحوم ۳۲۹ھ لکھتے ہیں۔ اور پروفیسر شیرانؔی ۳۲۲ھ یا ۳۲۳ھ پر استدلالؔ مصر ہیں۔''

اب دیکھئے پروفیسر حاجنؔی وہابؔ کو کس طرح فردوسؔی پر سبقت دیتے ہیں۔ وہابؔ کی خامیوں کو خوبیاں بنا کر پیش کرنے کا یہ سلیقہ شاید ہی کسی اور کو آتا۔ پروفیسر حاجنؔی اپنے بیان کو استدلال اور جواز کے ساتھ ماننے کیلئے قاری کو مجبور ہی نہیں بلکہ آمادہ بھی کرتا ہے۔ تاریخ کے ساتھ اس طرح کھیلنے کیلئے علمی سرمایہ کا دردست ہونا ضروری ہے۔ اور یہ علمی سرمایہ پروفیسر حاجنؔی کے پاس تھا۔

''اس کے مقابلے پر فردوسؔی کشمیر کی سوانح کو آج تک کسی نے چھوا بھی نہیں۔ اور جب کشمیر بزمِ ادب نے اس فروگذاشت کی تلافی کیلئے قدم اٹھایا تو ایک پورا ادارہ وہاب کی حیات کے خط وخال کی تنقید پر مامور اور متوجہ ہوا۔ اس لئے وہابؔ اس بارے میں فردوسی سے زیادہ خوش نصیب ہے کہ اس کی ادبی زندگی کے گونا گوں پہلوؤں کی جانچ پڑتال میں افسانہ نویسی، کذب بیانی اور بے جا مدح وذم کے امکانات کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔'' [1]

اس مضمون میں ادبیات عالم سے متعلق پروفیسر حاجنؔی کی واقفیت کا بھی برملا اظہار ملتا

---

[1] گلریز سالنامہ ستمبر واکتوبر ۱۹۵۳ء

ہے۔ فارسی، عربی اور اردو علوم اور تاریخ کا اُن کو گہرا گیان تھا اسی گیان کی بنیاد پر انہوں نے اس قسم کا عمدہ تقابلی مضمون لکھا ہے۔ حالانکہ تقابل کے دوران بھی وہابؔ کا ذکر زیادہ کیا گیا ہے اور فردوسی کا ذکر صرف اُس وقت کیا گیا ہے جب وہاب کو اُن پر فوقیت دینی مطلوب ہوتی ہے۔

مضمون میں شاہنامہ فردوسؔی اور شاہنامہ وہاب کا ایک بھرپور تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ وہابؔ پرے نے کہاں کن اشعار کو چھوڑا ہے۔ اور کہاں کہاں اچھوتی شان پیدا کی ہے۔ ان سبھی باتوں کی طرف پروفیسر حاجنی نے کامل بصیرت کے ساتھ اشارے کئے ہیں۔

> ''اس سے ایک ادبی نکتہ مترشح ہوتا ہے وہ یہ کہ فردوسی ایران وطن پرستی کے ساتھ ساتھ ادب برائے معاوضہ کا بھی قائل تھا اور وہابؔ تاریخ شناسی کے ساتھ ساتھ ادب برائے ملت کا دلدادہ''۔[1]

دیوانِ وہابؔ میں شامل ہر کوئی شعر یا نظم دوسرے شاعروں کی طرح ادب عالی کا نمونہ نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی نہیں کہ اُن کے پاس کچھ اچھا نہیں۔ بلکہ اُن کے قلم نے بہت سارے ایسے اشعار بھی صفحہ قرطاس پر بچھائے ہیں جو اُنہیں بلند مرتبت شاعروں کی صف میں کھڑا کرنے کیلئے کافی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کے دیوان میں یک رنگی نہیں ہے۔ بلکہ انسانی زندگی کو جتنے رنگ خوبصورت اور دلکش بنا سکتے ہیں وہ سبھی رنگ وہابؔ کے یہاں موجود ہیں۔

دیوان وہابؔ کا ایک خاص رنگ صوفیانہ رنگ ہے۔ وہابؔ پرے دین پرست ہونے کے ساتھ پیر مریدی کے زبردست پیرو کار تھے۔ دوسری بات یہ کہ وہ اپنی شاعری کو بھی بزرگانِ دین اور خدا کی عنایت سمجھتے تھے۔ اسلئے اُن کی شاعری میں متصوفیانہ فکر کا ہونا لازمی ہے۔ پروفیسر حاجنؔی کا وہابؔ پرے کے متعلق اگلا مضمون ''کشمیر کا فردوسی۔ تصوف کی دُنیا

---

[1] گلریز سالنامہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۳ء

میں ۔[1] '' گلریز کے مئی ۱۹۵۳ء کے شمارے میں چھپا۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجنیؔ نے وہابؔ پرے کے متصوفیانہ فکر کو موضوع بحث بنایا۔ اس مضمون میں واقعی حاجنیؔ صاحب نے اپنی ذہانت اور تخلیقی قوت سے وہاب کے اشعار کی تشریح کر کے اُن کو ایسے رنگوں میں رنگ دیا کہ وہابؔ پرے نے کبھی سوچا ہی نہیں ہوگا۔ ایک طرف وہابؔ کے متصوفیانہ انداز فکر کی وضاحت بڑے مدلل انداز میں کی دوسری طرف وہابؔ کے اشعار کو تصوف کے پیکر بنا کر انہیں ایک صوفی شاعر ثابت کیا۔ پروفیسر حاجنیؔ تصوف اور علومِ عربیہ کے نباض تھے اس لئے انہوں نے وہابؔ کو بھی اس رنگ میں رنگ دیا۔ حالانکہ خود ہی یہ بھی مانتے ہیں کہ اصل ہیں وہابؔ کا تصوف قنوطیت کی پیداوار ہے اور دنیاوی اتھل پتھل سے فرار کی راہ ہے۔

'' اسی لئے جمالیات سے قطعۂ نظر دیوانِ وہابؔ یاسیات سے معمور ہے ۔ جس کا محور '' غمِ روزگار '' اور قطبین جبر وقدر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ موخرالذکر کی پیدا کردہ اُلجھنوں سے تنگ آ کر وہابؔ علی العموم آب و گِل پر کیچڑ اُچھالتا ہے ۔۔۔۔ آپ اس منہاجِ تخیل کو فلسفہ فرار کہئے یا آریائی تصورِ حیات۔ اس کا نام غیر عربی تصوف رکھئے یا ریشیانِ کشمیر کی پیروی ''

وہابؔ کے فلسفہ تصوف کی طرف مائل ہونے کی وجوہات اور دنیاوی معاملات سے اس کی بے دلی کا اجمالی خاکہ کھینچنے کے بعد پروفیسر حاجنیؔ نے وہابؔ کے چند اشعار کی شرح کی ہے۔ اشعار کی شرح پڑھنے سے ہم پروفیسر حاجنیؔ کے فلسفہ تصوف اور مشرقی علوم پر اُن کی قدرت کا بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ایک شعر کی تشریح:

'' نیم کشتہ بر سرِ راہ ترأونس بے حال و ہوش
گاہ زندہ گاہ مردہ خفتہ گاہ بیدار گاہ[1]

---

[1] دیوانِ وہابؔ ردیفِ '' الف ''

کی تشریح کرتے ہوئے پروفیسر صاحب لکھتے ہیں۔

"شیخ لاشراق علیہ الرحمہ کے نزدیک کائنات فاعلی تنویر کا ایک زبردست عمل ہے۔ جہاں عقلی استدلال زیادہ سے زیادہ ہمیں چند اشارات مہیا کر سکے گا۔ جن کی بناء پر ہم قیاس کر سکیں گے کہ نور اولیٰ کی لامحدویت کا جزوی اظہار ہی کائنات ہے۔ جس کی تنویر کی مسلسل حرکت کی وجہ عشق کا وہ جذبہ ہے۔ جو مبداء نور سے مستفیض ہونے اور اسی طرف کی لوٹنے پر مضر ہے۔ اس طرح اشرافین کے نزدیک کائنات محبت کا ایک ابدی ڈرامہ ہے۔ جس میں حُزنیہ اور طربیہ دونوں کے ایکٹر بیک وقت کارفرما ہیں۔ اسلئے اس انقلابی دور میں جبکہ نور وظلمت کی توجہہ میں وہاب حیران تھا۔ اس کو اپنے وجود میں خواب و بیداری، غم وانبساط المختصر موت وحیات بیک وقت کارفرما نظر آنے لگے۔"

اس طرح پروفیسر حاجنؔی نے وہابؔ کو ایک پورا صوفی شاعر قرار دیا۔ جس نے ایک حسرت آفرین ماحول میں قحط، وباء، طاعون اور سیلاب سے ہزاروں کشمیریوں کو لقمہ اجل بنتے دیکھا۔ اس حوصلہ شکن اور روح فرسا مشاہدہ نے وہاب پرے کے ذہن کو حُزن، یاسیت اور قنوطیت پسند بنا ڈالا۔ ان مسائل اور الجھنوں کو ہی پروفیسر حاجنؔی وہاب کے صوفی شاعر بننے کی وجہ ثابت کرتا ہے۔ کہتے ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں غیر مہذب حکومت کے جور وظلم اور کشمیریوں کی عام مفلوک الحالی نے اول ہر کشمیری شاعر کے لئے ایک حسرت آفریں ماحول پیدا کر دیا تھا۔ دوئم "وہاب نے اپنی زندگی میں کئی بار قحط، وبا، طاعون اور سیلاب سے ہزاروں کشمیریوں کو لقمہ اجل بنتے دیکھا اور اس حوصلہ شکن اور روح فرسا مشاہدہ پر عجمی تصوف اور ایرانی ادبیات نے وہابؔ کے ذہن کو کشاں کشاں حزن پسندی کا شیدائی بنا ڈالا۔"

ادب تاریخ بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہی ادب پارہ صدیوں کی عمر پاتا ہے جو اعلیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کی تاریخ بھی ہو۔ ہر بڑا ادب پارہ اپنے زمانے کی تاریخی دستاویز ہوتا ہے۔ میر تقی میرؔ کو دلی کا نوحہ گر کہا جاتا ہے۔ غالبؔ کے خطوط غدر کے حالات کے گواہ ہیں۔ گیان چند جین کا ماننا ہے کہ اگر اٹھارویں صدی کے ہندوستان کی سماجی تاریخ رقم کرنی ہو تو اس کے لئے بنیادی ماخذ کا کام اُس زمانے میں لکھی گئی اردو داستانوں سے زیادہ شاید ہی کوئی دوسری دستاویز کر سکتی ہے۔ میر حسنؔ کی مثنوی ''سحر البیان'' اور ''نسیمؔ کی مثنوی ''گلزارِ نسیم''۔ اعلیٰ پایہ کی مثنویاں ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانوں کی سماجی تاریخ بھی ہیں۔ مرزا ہادی رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' بھی اپنے زمانے اور غدر کے دوران پیش آنے والے حالات کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ ایک بات طے ہے کہ ایک بڑا شاعر یا ادیب ایک اچھا مورخ بھی ہوتا ہے۔ پروفیسر حاجنیؔ کو اس بات کا گہرا علم تھا کہ اگر شاعر مورخ ہو تو اس کے فن کی چھاپ صدیوں تک رہتی ہے۔ اسی لئے انہوں نے اب وہابؔ کی شاعری کو ایک تاریخی دستاویز بنا کر پیش کرنے کی ٹھان لی۔

وہاب پرے کے یہاں بھی تنوعِ مضامین ہیں جہاں ایک طرف اُس کی شاعری میں قنوطیت اور یاسیت چھائی ہوئی ہے۔ وہی اُن کی شاعری یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہاب ایک بہت بڑے visionary تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں آنے والے زمانے کے متعلق بہت ساری پیشن گوئیاں کی تھیں جو سب اپنے وقت پر صحیح ثابت ہوئیں۔ اس کے علاوہ وہاب کی شاعری ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ وہابؔ پرے کے متعلق حاجنی صاحب کا جو آخری مضمون گلریز کے مارچ ۱۹۵۴ء کے شمارے میں چھپا۔ اُس کا عنوان ''وہاب۔ بحیثیت مورخ کشمیر'' تھا۔ اس مضمون میں حاجنی صاحب نے وہاب پرے کو ایک مورخ کی حیثیت سے قارئین اور ادب نوازوں کے سامنے پیش کیا۔ پروفیسر حاجنیؔ کو اس بات کا اندازہ بخوبی تھا کہ وہابؔ کو جاودانی عطا کرنے کے لئے اُن کی شاعری میں موجود مختلف عناصر کو ٹٹول کر قارئین کے سامنے لانا ہوگا۔ اسی لئے انہوں نے وہابؔ کی شاعری میں موجود تاریخی حوالوں اور تاریخی عناصر پر مدلل مضمون لکھا۔

پروفیسر حاجنی کے مطابق وہاب نے اپنی شاعری میں تاریخ کشمیر کے جن ادوار کا ذکر کیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ چک خاندان کا آخری دور۔

۲۔ افغانوں کا آخری دور۔

۳۔ ڈوگرہ شاہی کے ابتدائی ساٹھ سال۔

پروفیسر حاجنی لکھتے ہیں۔

''وہاب نے اپنی تخلیقات میں تاریخ اسلام اور تاریخ کشمیر کے متعدد ادوار کو بیان کرلیا ہے۔آج کی قسط میں وہی حصے بیان کئے جائیں گے جو تاریخِ کشمیر سے متعلق ہیں

تاریخ کشمیر کے مندرجہ ذیل ابواب پر وہاب نے وضاحت کے ساتھ رائے زنی کی ہیں۔

(ا) چک خاندان کا آخری دور (ب) افغانوں کا آخری دور

(ج) ڈوگرہ شاہی کے ابتدائی آٹھ سال۔''

مضمون میں ان ہی تین عنوانات کے تحت وہاب کی شاعری سے ان ادوار کے متعلق حوالہ جات پیش کرتے ہوئے وہاب کو ایک مورخ ثابت کیا ہے۔وہاب کی شاعری پر بات کرتے ہوئے پروفیسر حاجنی تاریخ عالم خصوصاً اسلامی مما لک کے تاریخی المیہ پر کھل کر بات کرتے ہیں۔ مضمون کے پہلے حصے میں چک خاندان کی انتقامی سیاست کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

'' اگر وہاب نے بنظرِ غائر فرقہ بندی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا۔تو اس کو یقین آتا کہ عربوں کی قبائلی عصبیت اور ایرانیوں کی جبلی قوم پرستی نے جس سیاسی اختلاف کو مذہبی رنگت دے کر شیعہ سنی تنازعہ کی طرح ڈالی ہے۔وہ فی الحقیقت عملی دنیا میں ایک طرف ملاّ و مجتہد کے لئے ذریعہ معاش ثابت

ہوگئی۔اور دوسری طرف وحدتِ اسلامی کی بیخ کنی کی باعث بھی بنی!''

چک دور کے سیاسی انتشار، مسلکی تعصب اور کھلبلی کو وہاب نے اپنی شہرۂ آفاق عقیدتی تصنیف ''سلطانی'' میں بیان کیا ہے۔''سلطانی'' حضرت سلطان العارفینؒ کی منظوم سوانح ہے۔چونکہ وہابؔ پرے کو حضرت سلطان العارفینؒ کے ساتھ بے پناہ عقیدت تھی اور انہوں نے یہ ترجمہ اسی عقیدت کی بنیاد پر کیا۔اس لئے انہوں اس زمانے کے سیاسی اور مسلکی حالات کو بھی اپنے ہی اعتقاد کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی۔اسی کوشش کے نتیجے میں وہ جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے چک خاندان کے ظلم و جفا کو شدت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔اس جانبداری کے متعلق پروفیسر حاجنیؔ رقمطراز ہیں۔

''سلطانیؔ چونکہ شیخ حمزہ مخدومؒ کے پانچ خلفاء کی نگارشات کا ترجمہ ہے۔اس لئے وہابؔ نے بحیثیت مترجم حق تو ادا کردیا،لیکن بحیثیت مورخ غیر جانبدار نہ رہ سکا۔اور اپنے معتقدات کی کسوٹی پر دوسروں کو پرکھنے لگا''۔

مضمون کے دوسرے حصے میں کشمیر میں افغانیوں کے ظلم وستم کی کہانی اور اس دور میں کشمیر کے سیاسی انتشار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اس دور کے حالات کا بیان وہابؔ نے ''اکبر نامہ'' میں کیا ہے۔''اکبرنامہ'' پر بات کرتے ہوئے پروفیسر حاجنیؔ نے افغانوں اور سکھوں کے تنازعات اور ان دونوں کے ذریعے کشمیر پر کئے گئے ظلم کی کہانی کو موثر انداز میں بیان کیا ہے۔لکھتے ہیں۔

''افغانوں کے عہد میں کشمیر کا مجموعی طور وہی حال ہوا۔جو دکن میں مرہٹوں کے عہد میں تھا۔''

اس مضمون کے آخری حصے میں ڈوگرہ تسلط کی روئداد بیان کی گئی ہے۔یہ زمانہ وہابؔ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔بلکہ اس زمانے میں وہابؔ خود کئی عہدوں پر فائز رہا۔پروفیسر حاجنیؔ اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

''وہابؔ خود اس زمانے کے اکثر دیہاتی منصبوں مثلاً حلقہ دار، کاردار، تحویل دار اور نائب تحصیلدار کی لطافت یا کثافت کا تجربہ کر چکا تھا۔ اس لئے عوام کی بد حالی بالخصوص مزارعین کی تباہ حالی سے اس کو پوری واقفیت تھی۔ اور اس بارے میں اس سے زیادہ صاف گو مورخ آج تک میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اور اس کا چشم دید بیان کسی شرح کا محتاج دکھائی نہیں دیتا۔''

اس مضمون کو پڑھنے کے بعد قاری کو ایک حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ جہاں ایک طرف پروفیسر حاجنؔی نے وہابؔ پرے کو ایک مورخِ کشمیر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ویہی یہ بات صاف سامنے آئی ہے کہ حاجنی صاحب خود بھی ایک ذی حس تاریخ دان تھے۔ انہوں نے جس انداز سے کشمیر کی تاریخ کو بیان کیا ہے۔ اُسے ہسٹری پر اُن کی مظبوط گرفت اور ان کے تاریخی شعور کا بھرپور انداز ہوتا ہے۔

اس طرح پروفیسر محی الدین حاجنؔی نے وہابؔ پرے کو جہاں ایک طرف ''فردوسی کشمیر'' قرار دے کر ادب کی بہت بڑی خدمت کی۔ وہی دوسری طرف انہیں تصوف کے رنگ میں رنگ کر اپنے اور وہابؔ پرے کے عقیدے سے بھی انصاف کیا۔ اور آخر پر انہیں ایک مورخ ثابت کر کے اُنکی شاعری کو تاریخ بنا کر وہابؔ کے نام کو بلندیوں پر پہنچا دیا۔ یہ صرف پروفیسر حاجنؔی صاحب کی ہی بدولت ہے کہ آج وہابؔ پرے کو مقبول کرالہ واری، محمود گامی اور شمس فقیر کے ساتھ ساتھ کلہن اور حسن شاہ کھویہامی کی صفوں میں یکساں درجہ حاصل ہے۔ لیکن ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں حاجنؔی صاحب کے یہ مضامین ادب عالی کے نمونے ہیں وہی یہ کہ ان میں عقیدت کا عنصر غالب دیکھنے کو ملتا ہے۔ پروفیسر حاجنؔی اوّل سے آخر تک وہابؔ کو ایک عظیم شاعر کی صورت میں پیش کرنے کی دھن میں مگن رہے۔ اسی دھن

میں وہ اُن کی شاعری کی خامیوں کی طرف اشارہ کرنا بھول گئے۔ ان مضامین میں پروفیسر حاجنیؔ نے ملی جلی زبان استعمال کی ہے۔ کئی پر خالص علمی اور عالمانہ زبان اور کئی عام فہم اور عوامی زبان کا استعمال کیا ہے۔

پروفیسر حاجنیؔ صاحب کے اِن مضامین نے علمی و ادبی حلقوں کو چونکا دیا۔ کیونکہ اب تک لوگوں کو وہابؔ کے بارے میں زیادہ معلوم نہ تھا اور نہ ہی انہیں حاجنیؔ صاحب کی اس قدر گہری علمی بصیرت اور تنقیدی نظر کا اندازہ تھا۔ ان مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد امین بچھؔ لکھتے ہیں۔

> ''شاعر وہابؔ اور اس پر لکھنے والا پروفیسر حاجنیؔ جیسا ابوالقلم جس نے وہاب کا تعارف دنیا کے ساتھ اس طرح کرنا شروع کیا ہے کہ وہابؔ کی شاعری ادیبوں کی توجہ اپنی طرف بڑے شدومد سے کھینچنے لگی ہے۔ وہابؔ کی عظمت سے کسی کو شک کرنے کی مجال ہو ہی نہیں سکتی اور اس کا سہرا پروفیسر موصوف کے سر ہے۔''[1]

ان مضامین کے شائع ہونے کے بعد وہابؔ سے متعلق ادبی حلقوں میں سنجیدگی پیدا ہوئی۔ اُن کے کلام کو پرکھنے اور پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہاب پر اچانک محققین کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ اب اُن کے متعلق لوگوں نے لکھنا شروع کیا۔ حلقہ ادب سوناواری حاجن نے اپنے ترجمان رسالے ''وولر کی ملر'' کا وہابؔ نمبر شائع کیا۔ ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی کے لئے موتی لال ساقیؔ نے وہابؔ کا مونوگراف ''ہندوستانی ادب کے معمار'' سیریز کے تحت تیار کیا۔

---

[1] گلریز سالنامہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۳ء

اور بھی بہت سارے اداروں نے وہابؔ پرے کی زندگی اور اُن کی ادبی خدمات سے متعلق خصوصی نمبرات اور شمارے شائع کئے۔ ایک بات جو مشترک ہے وہ یہ کہ ان سب رسائل اور جرائد کیلئے بنیادی ماخذ پروفیسر حاجنؔی کے ہی مضامین رہے۔

پروفیسر حاجنؔی کا وہاب پرےؔ کی حیات اور ادبی کارناموں پر اس طرح قلم اُٹھانا اصل میں ایک تحریک کا حصہ ہے۔ وہ کشمیریوں کو اپنے شاندار ماضی اور اسلاف کی جانکاری دینا چاہتے تھے، جس کے لئے انہوں نے وہاب کو ایک محرک کے طور پر استعمال کیا۔ اُن کی اس سوچ کے بارے میں پروفیسر شفیع شوقؔ لکھتے ہیں۔

> ''کشمیریوں کی غلامی کا آغاز مغلوں کی آمد سے ہوا اور وہ اس غلامی کا سب سے بڑا سبب کشمیری مسلمانوں کی ذہنی پژمردگی اور اپنے ماضی سے غفلت سمجھتے تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے کشمیریوں کی زبان، ان کے ادب اور ان کی ثقافت کی افہام و تفہیم کے لئے ان تھک کوشش کی۔ ان سب معاملوں پر ان کا اپنا مخصوص نظریہ تھا اور وہ اس سے بدلنے کے لئے تیار نہ تھے''[1]

کشمیری زبان و ادب کے ساتھ اسی بنیاد پر حاجنؔی صاحب کی زبردست وابستگی تھی۔ وہ سوتے جاگتے اس زبان کے بارے میں سوچتے تھے۔ اُن کے اہم جلیس معراج الدین بازیافت ۱۹۵۳ء کے ''گوشۂ حاجنؔی'' میں لکھتے ہیں۔

---

[1] بازیافت ''گوشۂ حاجنؔی'' شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۳ء

"کشمیری زبان و ادب کے تیئں اُن کی خدمت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ بات میں اُن کے بطور ادیب نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ عملی میدان میں انہوں نے اس بدنصیب قوم کی زبان کی ترقی و ترویج کے لئے انتھک کام کیا۔"

میری نظر میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ان مضامین کو ایک کتابی صورت میں شائع کیا جانا چاہیے، وہ پروفیسر حاجنی اور وہاب پرے کے لئے سب سے بڑا اخراج ہوگا۔ ساتھ ہی کشمیری ادب کی ایک بہت بڑی خدمت بھی ہوتی۔

کلامِ دیگرے

پروفیسر محی الدین حاجنیؔ کشمیر کے دانشوروں اور اپنے ہم عصر مفکروں اور ادیبوں کی صف میں مانندِ خورشید نظر آتے ہیں۔ اُن کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے کشمیری زبان کی تحریک کو اُردو میں بھی آگے بڑھایا۔ انہوں نے اردو میں جتنے بھی مضامین لکھیں۔ ان میں انہوں نے زیادہ تر میں کشمیری شعراء کی زندگی اور اُن کے ادبی کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔ اسکے علاوہ کشمیری لوک ادب بھی اُن کی دلچسپی کا میدان رہا ہے۔ اُن کا ماننا تھا کہ لسانی اور ثقافتی طور سے وہی قوم صحت مند اور زندہ رہتی ہے جس قوم کے لوک ادب کی روایت صحت اور مند مضبوط ہو۔ اِس لئے انہوں نے جس زبان میں بھی لکھا، کشمیری لوک ادب کی تاریخ کو ضرور ٹٹولا۔ وہاب پرے کے بعد محی الدین حاجنیؔ نے ''مولوی صدیق اللہ حاجنیؔ'' کی حیات اور ادبی کارناموں پر ایک مفصل مضمون رقم کیا۔ اس مضمون کے علاوہ محی الدین حاجنیؔ نے ''کشمیری لوک ادب کا خاکہ'' مضمون لکھ کر کشمیری لوک ادب کی روایات کا مدلل خاکہ پیش کیا۔

''ابتدائی ریشی سلسلے کا ایک تاریخ جائزہ'' اور ''کشمیری ادب کی چند تاریخی تلمیحات'' کے عنوان سے مضامین لکھ کر پروفیسر حاجنیؔ نے کشمیری تہذیب و ثقافت کی خدمت کرنے کے علاوہ کشمیر کے دامنِ اُردو میں نگینے جڑ کر ایک بہت بڑا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ حاجنیؔ صاحب نے کشمیر کے سائنٹفک (Scientific) ادیب مرزا غلام حسن بیگ عارفؔ کی ایک رباعی کی تشریح ''آگ اور مرزا عارف کی ایک رباعی'' کے عنوان سے کر کے مرزا عارف کو ایک بڑا ادیب بنا کر پیش کیا۔ منصور جس کی تصنیف ''کتاب الطّواسین'' کا حاجنیؔ صاحب نے اُردو میں شرح لکھا تھا، اور اقبالؔ جو کہ برصغیر ہندو پاک کے سب سے بڑے دانشور شاعر ہیں، کا ایک تقابلی مطالعہ بھی پروفیسر حاجنیؔ نے پیش کیا۔ یہ مضمون ''اقبال اور حلاج'' کے عنوان سے ''محفل اقبال'' میں شائع ہوا۔ اب پیش ہیں ان مضامین کے ایک مختصر جائزے۔

مولوی صدیق اللہ حاجنیؔ

حاجن کے ادبی آسمان کے درخشندہ ستاروں میں ایک ستارہ ''مولوی صدیق اللہ حاجنیؔ'' ہے۔ مولوی صدیق اللہ حاجن کے ایک معزز اور پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مولوی صدیق اللہ حاجنیؔ ایک باوقار روحانی بزرگ تھے۔ لوگ دور دور سے ان کے پاس اپنی مرادیں لے کر آتے اور ان کے دربار سے فیض یاب ہوتے تھے۔ پیر مریدی اُن کے خاندان میں صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ مولوی صدیق اللہ حاجن کے روحانی بزرگوں کی صف میں دیو قامت نظر آتے ہیں۔ ایک باکمال روحانی بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک معتبر سخن وراور عالمِ دین تھے۔

اگرچہ مولوی صدیق اللہ ۱۵ر ربیع الاول ۱۲۴۸ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۵ر شعبان المعظم ۱۳۱۸ھ کو انتقال کر گئے۔ لیکن پروفیسر محی الدین حاجنیؔ کے قلم اٹھانے تک اُن کی زندگی پردۂ راز میں ہی تھی۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۴ء کے ''گلریز'' کے سالنامے میں پروفیسر محی الدین حاجنیؔ کا ''مولوی صدیق اللہ حاجنیؔ'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجنیؔ نے مولوی صدیق اللہ کے حالات زندگی کی آڑ میں کشمیر کی اقتصادی اور سیاسی بدحالی کے علاوہ جاگیردارنہ ظلم وستم کی ایسی تصویریں کھینچی ہے کہ پڑھنے سے قاری کے دل میں شدت جذبات اوراحساس سے خوف پیدا ہوتا ہے۔

محی الدین حاجنیؔ ایک سچے کشمیری تھے۔ کشمیر کی محبت اُن کے ریشے ریشے میں تھی۔ وہ کشمیری قوم کے ہمدرد اور خیر خواہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ذکر چاہیے کسی شاعر کی زندگی کا ہو رہا ہو یا کسی کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا جا رہا ہو۔ کشمیر کی قسمت پر حاجنیؔ ہر جگہ ماتم کرتے ہوئے نظر

آتے ہیں۔ چونکہ جس ماحول میں مولوی صدیق اللہ نے آنکھیں کھولیں، وہ ماحول کسی بھی لحاظ سے کشمیر اور کشمیریوں کیلئے اطمینان بخش نہ تھا۔ اس مضمون کی ابتداء پروفیسر حاجنی کشمیر کی قسمت کا نوحہ لکھتے ہوئے اس طرح کرتے ہیں۔

> ''کشمیر کی یہ بدبختی بہت دیرینہ ہے کہ اسکی قسمت کا فیصلہ اس کی حدود سے باہر کیا جاتا ہے۔ فیصلہ کرنے والے بالعموم غیر کشمیری ہوتے ہیں اور جب کسی شاہانہ فیصلہ کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ تو اس عزم وقوت کے ساتھ اس پر کارروائی شروع ہوتی ہے۔ گویا ہر کشمیری نے ''بحواس خمسہ'' بلا کسی جبر و اکراہ'' اس فیصلے کے کارپردازوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔'' [1]

چونکہ تیرہویں صدی ہجری سیاسی، اقتصادی اور معاشی لحاظ سے کشمیر کیلئے آفتوں کی صدی تھی۔ اس لئے اس صدی کی ہر کوئی کہانی دل آزار ہے۔ پہلے سکھوں کی حکومت میں عام لوگوں پر ظلم و جبر کی یہ حد کہ لوگ نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے، اس کے بعد شیر سنگھ کا قحط۔ پھر کشمیریوں کو بیچنے اور خریدنے کا عمل، ان آفات نے کشمیریوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ انہی روح فرسا حالات میں مولوی صدیق اللہ نے جنم لیا اور جوان ہوئے۔ یہ بات عیاں ہے کہ صدیق اللہ کے والد مولوی عبدالفتاح کو ان کی پرورش کرنے میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس زمانے میں بقولِ مصنف تاریخِ جدولی ''دو سیر چاول ایک روپیہ میں بھی نہ ملتے تھے اور ایک روپیہ کسی کے پاس تھا ہی نہیں''، تو مولوی عبدالفتاح کے گھر کا گزارہ کیسے چلا ہوگا، سوچنا بھی مشکل ہے۔ لیکن اپنے ابتدائی زمانے کے ان حالات کا ذکر نہ ہی بعد میں عالم و

---

[1] گلریز سالنامہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۴ء

فاضل مولوی صدیق اللہ نے کہی کیا ہے اور نہ ہی کسی اور نے اس بارے میں کچھ لکھا ہے۔ پروفیسر حاجنؔی جس نے وہاب پرے کی زندگی کے حالات کرید کرید بزرگوں سے حاصل کئے، صدیق اللہ کے متعلق جانکاری حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

''حاجن میں سبز قدم خوشحال سنگھ کے کارندوں نے وہ تباہی مچادی کہ نمازِ جمعہ کی جماعت بھی نہ ہوسکی۔ امامِ مسجد شیخ جمیل برادرِ شیخ عبدالفتاح تارہ زدہ بھاگا۔ اور مقتدی معاش کی تلاش میں اس قدر پریشان ہوگئے کہ مسجد ہی بے چراغ رہی۔ عوام کا جب یہ حال ہو تو عبدالفتاح وعظ خوانی سے کیا پاتے کہ صدیق اللہ کی تربیت پر خرچ کرتے۔ اس ذلیل عہد میں کسی کے ہاں بچہ پیدا ہونا یا پیدا ہوکر اس کا بچنا معجزہ سمجھا جاتا تھا، اس لئے صدیق اللہ کی زندگی کے ابتدائی چودہ پندرہ سال سے متعلق کوئی معلومات حاصل نہ کی جاسکی۔۔۔۔۔ اقتصادی بدحالی کا یہ زمانہ اس قدر خوف آفریں تھا کہ بالغ ہوکر بھی مولوی صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی کی دردناک داستان کو قلمبند نہیں کردیا۔''

اس مضمون کے پہلے حصے میں پروفیسر حاجنؔی نے مولوی صدیق اللہ کی زندگی کی آڑ میں کشمیر کے سیاسی اور اقتصادی حالات کا بے باک ہوکر تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے مولوی صدیق اللہ کی زندگی سے زیادہ کشمیر کی بدحالی کا رونا رویا ہے۔ اس طرح مولوی صدیق اللہ کی حیات کا تذکرہ کرتے ہوئے محی الدین حاجنؔی نے کشمیر کی تاریخ کے اوراق الٹنے کے ساتھ ساتھ کشمیریوں کی بے بسی اور لاچاری پر مرثیہ کیا ہے۔

اس مضمون کے دوسرے حصے میں پروفیسر حاجنؔی نے مولوی صدیق اللہ حاجنؔی کی

تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔ مولوی صدیق اللہ حاجنیؔ کی تمام تخلیقات مذہبی نقطہ نظر کی حامل ہے۔ انہوں نے کشمیری شعروادب کی قابلِ قدر خدمت کی ہے۔ اُن کی تخلیقات میں (۱) سکندر نامہ (۲) مغازی النبیؐ (۳) الفرائض المنظوم (۴) و مایا (۵) نجوم الشھابیہ رجوم للوھابیہ (۶) شکل وشمائل آنحضرتؐ (۷) بدائع المنظوم (۸) معجزاتِ رسول (۹) انہار اربعہ (۱۰) عقائد ہیں۔

چونکہ صدیق اللہ ایک مذہبی عالم تھے اور پوری زندگی وہ وعظ وتبلیغ کرتے رہے۔ اس لئے اُن کی تخلیقات بھی اسی نوعیت کی ہیں۔ ان تخلیقات کے مطالعہ کے بعد آسانی سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ صدیق اللہ نے جو کچھ بھی لکھا خالص اس بنیاد پر لکھا کہ دین کے معاملات، فقہی مسائل اور سیرت رسول ﷺ عام لوگوں کے ذہن میں صحیح صورت میں اُترے۔ چونکہ اس زمانے میں لوگ شعروشاعری کے زبردست دلدادہ تھے اس لئے انہوں نے شاعری کا ہی وسیلہ اختیار کیا۔ پروفیسر حاجنیؔ صاحب نے ان تخلیقات پر مختصر لیکن پرمغز تبصرہ کیا ہے۔ اُن کے اس مضمون کو پڑھ کر انسان کی سوچ کہیں بھی جائے لیکن آخر پر لوٹ کر پروفیسر حاجنیؔ کی عالمانہ بصیرت ہی سوچ پر چھا جاتی ہے۔ ایک بات قابل ذکر ہے کہ ان تخلیقات پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حاجنیؔ نے کشمیریوں کی توہم پرستی اور سماج میں موجود رسومات بد کا نقشہ ایسا کھینچا ہے کہ قاری جیسے اُس توہم پرستی اور رسومات یا یوں کہیئے ملاؤں کے استحصال کی دُنیا میں خود بخود پہنچ جاتا ہے۔ مولوی صدیق اللہ حاجنی کی تخلیق ''الفرائض المنظوم'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ کشمیریوں کی توہم پرستی اور یہاں پنپ رہی رسومات کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

''اگر اس زمانے میں کسی مسلمان کے ہاں میت ہوتی۔ تو ملا کے نام روز

چہارم کی فاتحہ خوانی کے ساتھ ایک ڈنڈا، ایک پُلہر (پاپوش کاہ) ایک پوٹلی ''یاجہِ'' (کشمیری طرز کے پکوڑے) ایک سوئی اور دھاگے کا گٹا اس دعویٰ پر واجب الادا تھے کہ میت کو ''کاجی ڈاری'' نامی ایک پہاڑی کو پار کرنا تھا۔ اور یہ چیزیں کوہ پیمائی کی کٹھن منزل میں مردہ کو زندہ رکھتیں تھیں۔ جس جگہ میت کو غسلِ آخر دیا جاتا۔ وہاں کئی روز چراغ جلانا پڑتا۔ مقبرہ پر اپنے چہیتے رشتہ داروں میں سے کسی ایک کو دن رات کئی روز تک پہرہ دینا پڑتا۔

اس مضمون میں پروفیسر حاجنیؔ نے مولوی صدیق اللہ کے فن یا اُن کی ترجمہ کاری پر بات کرنے سے زیادہ کشمیر اور کشمیریوں کی کسمپرسی کا تذکرہ کیا ہے۔ ساتھ ہی یہاں کے لوگوں کے غلط عقائد، رسوماتِ بد، توہمات اور لاعلمی کو بھی دل کھول کر کوسا ہے۔ مولوی صدیق اللہ حاجنیؔ نے اپنی اکثر تصنیفات میں کشمیریوں کے غلط عقائد، توہم پرستی، فقہی انتشار اور لاعلمی کا تذکرہ کیا ہے شاید اسی لئے پروفیسر حاجنیؔ نے بھی ان چیزوں پر دل کھول قلم اٹھایا ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجنیؔ نے جہاں کشمیری تاریخ کے بھیانک مناظر کو پیش کر کے قارئین کو چونکا دیا ہے وہی ایک گمنام شاعر کو بھی دنیائے ادب میں صرف زندہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کا قد بھی مقرر کیا اور شاید ہی آج تک کشمیر کا کوئی مذہبی شاعر اُن کے قد کو پہنچ سکا ہے۔ مولوی صاحب کی مشہور ترجمہ ''نجوم الشہابیہ، رجومُ للوہابیہ'' پر تبصرہ کرتے پروفیسر حاجنیؔ مولوی صاحب کو اس طرح عظمت کی سند عطا کرتے ہیں۔

''ہر شعر کی سند میں کلام اللہ کی کوئی نہ کوئی آیت یا حدیثِ نبوی ﷺ یا قولِ امام حواشی پر درج ہے جن کے ساتھ ساتھ مطالعہ سے شعر کا مفہوم ذہن میں پورا اُترتا ہے''

مولوی صاحب کی ایک عقیدتی اور مذہبی تخلیق ''شکل وشمائلِ آنحضرت ﷺ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حاجنیؔ اُن کی فنی مہارت کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں۔

''مولوی صاحب چونکہ شعر سے زیادہ شرع کے دلدادہ تھے اس لئے نفسِ مضمون سے متعلقہ احادیث کو اس صنفِ شعر میں ادا کر دیا۔ جس میں تکلف سے بہت کم کام لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ شاعرانہ تقاضوں کے باوجود انتہائی احتیاط کے ساتھ حلیہ مبارک کو پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ عقیدت یا شاعری واقعات پر غالب نہ آسکیں۔ سخن وری کی پوری رعایت کے باوجود اس مقدس موضوع کو شاید اس سے سادہ تر زبان میں ادا کرنا ممکن نہ تھا''

اس مضمون میں ایک اہم چیز دیکھنے کو ملتی ہے، وہ یہ کہ پروفیسر حاجنی نے مولوی صاحب کی تخلیقات کا تجزیہ یا تقابل کرتے وقت ان کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے، جو کہ وہاب پرے سے متعلق لکھے گئے مضامین میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ جہاں پر بھی پروفیسر حاجنی کو کوئی خامی نظر آئی اس کا اظہار انہوں نے برملا کیا ہے۔ حالانکہ مولوی صاحب کے معاملے میں ایک مشکل یہ تھی ان کے موضوعات مذہبی ہے اور ان میں خامیاں نکالنا بہت ہی کٹھن اور مشکل کام تھا۔ لیکن حاجنی صاحب اس کٹھن منزل کو اپنے علم کے بل پر بڑے آرام سے پار کرتے ہیں۔ یہ دیکھئے مولوی صاحب کی تخلیق ''مغازی النبیؐ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حاجنی کس طرح اس تصنیف کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

''اگر مولوی صاحب کفار کی ہزیمت کے وقت ذرا غور کرتے اور نتائج کو پرکھتے تو اُن کو غزوات النبیؐ کی تہہ میں ایک ایسا انقلاب نظر آتا جس نے گذشتہ تیرہ صدیوں میں عالمِ اسلام کے سہارے کا کام دیا ہے۔ وہی یہ کہ رسول اللہ ﷺ زندگی کے ہر موڑ پر رحمتہ اللعالمینؐ ہیں، خواہ وہ میدانِ کارزار ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے آنحضور ﷺ رحمتہ اللعالمین کے بجائے ایک عظیم فاتح نظر آتے ہیں۔ حالانکہ معاندینِ اسلام تک کو یہ اعتراف ہے کہ انہوں نے جو جنگیں لڑیں ان میں سے اکثر مدافعانہ تھیں''

اس مضمون میں پروفیسر حاجنیؔ نے عام فہم زبان اور اسلوب اختیار کیا ہے۔ یہ مضمون حقیقی معنوں میں اپنے اندر تاریخ، تحقیق اور تنقید کے امتزاج کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس مضمون سے پروفیسر حاجنیؔ کی علمی بالیدگی اور اسلامی تاریخ اور دوسرے علوم پر اُن کی دسترس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ مولوی صدیق اللہ حاجنیؔ کے متعلق پروفیسر حاجنیؔ نے اُس قسم کی دلچسپی نہیں دکھائی جو انہوں نے وہاب پرےؔ کے متعلق دکھائی ہے۔ وہاب کے موضوعات کا انہوں نے الگ الگ مطالعہ پیش کیا جبکہ صدیق اللہ کی تمام تصنیفات کو ایک ہی مضمون میں سمیٹا ہے۔ ہونا تو یوں چاہیے تھا کہ اُن کی تصنیفات کا جائزہ الگ الگ عنوانات کے تحت الگ الگ مضامین میں لیا جاتا۔ اس سے ایک تو پروفیسر حاجنیؔ کو اپنے علمی دریچوں کو وا کرنے کا موقع ملتا، دوئم مولوی صدیق اللہ کے ساتھ اور ان کی گراں قدر تصانیف کے ساتھ بھی انصاف ہوتا۔ چونکہ حاجنیؔ صاحب لا اُبالی طبیعت کے مالک تھے اور یکسوئی کے ساتھ کوئی ایک کام نہیں کرتے تھے اس لئے یہاں بھی انہوں نے وہی سرسری انداز اختیار کیا ہے۔

اس مضمون کے بعد مولوی صدیق اللہ کی حیات اور ادبی کارناموں سے متعلق پروفیسر حاجنیؔ نے دو اور مضامین لکھے۔ ایک مضمون کا عنوان ''مولوی صدیق اللہ بحیثیت مبلغ تہ مذہبی شاعر'' ہے اور یہ مضمون حلقہ ادب کے ترجمان رسالہ ''وولر کی ملر'' میں ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ جبکہ اُن کی حیات اور شاعرانہ خوبیوں سے متعلق ایک مفصل مقالہ ''کلیاتِ صدیق اللہ'' میں ۱۹۸۰ء میں تقریظ کے طور پر شامل ہوا۔ ان مضامین میں پروفیسر حاجنیؔ نے پوری طرح مولوی صدیق اللہ حاجنیؔ کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

کشمیری زبان کے نثری لوک ادب کا خاکہ

لوک ادب کسی قوم یا کسی عوامی گروہ کی مشترکہ ثقافت کے اجتماعی اظہار کا نام ہے۔اس کے دائرے میں اس قوم یا گروہ سے وابستہ رسم ورواج، عقائد، مفروضات، توہمات وغیرہ سے متعلق زبانی یا سینہ بہ سینہ چلنے والی کہانیاں، گیت، کہاوتیں اور مذاق کی باتیں شامل ہیں۔ کسی قوم کی تاریخ اور اُس قوم کی ذہنی ارتقاء کا جائزہ لینے کیلئے یہ بات ضروری ہے، کہ اُس قوم کے لوک ادب کے بارے میں جانکاری ہو۔ کیونکہ تاریخی اور ذہنی نشو ونما کو سمجھنے میں لوک ادب مدد بھی دیتا ہے اور قوم کی ذہنی ارتقاء کی تہذیب و تنظیم بھی کرتا ہے۔

لوک ادب اُس وسیع اور بیکراں انسانی اثاثے کا ایک حصہ ہے۔ جس کے لئے انگریزی میں Folk Lore کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ Folk Lore کی وسیع اصطلاح ۱۸۴۶ء میں ایک انگریز ولیم جان تھامس، نے وضع کی۔ تھامس قدیم علوم کے ماہر جانے جاتے تھے۔ لوک ادب کو 'زبانی ادب۔ Oral Literature' بھی کہا جاتا ہے جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلا آیا ہے اور جس میں ہماری بولتی تاریخ محفوظ ہے۔ لوک ادب ہماری روایتی تہذیبی قدروں کا آئینہ ہی نہیں بلکہ نگہبان بھی ہے۔

اپنی جبلی ضرورتوں کے پیش نظر انسان نے قصے کہانیاں سننی اور سنانی شروع کی۔ ان قصہ کہانیوں میں اساطیری اور دیو مالائی دنیا آباد کر کے محیر العقل کردار تخلیق کیئے۔ وہ کہانیاں

اور کردار، وہ قصے اور واقعات کہ سن کر انسان کے کہیں رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہیں دیکھ کر حیرت سے منہ کھلا رہ جاتا ہے۔ دینا کے مختلف قوموں کی تاریخ کا جائزہ لینے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ رُستم وسہراُب، لیلیٰ ومجنوں، شیریں وفرہاد، ہیمال ناگرائے، یزدان واہرمن، جولیٹ ورومیو، نیکی وبدی کے حاصل اساطیری کرداروں کی توضیح جداگانہ ہوتے ہوئے بھی کس قدر ملتی جلتی ہے۔ اس سے ایک بات صاف دکھائی دیتی ہے کہ انسان زمین کے کسی بھی کونے میں آباد ہو، ان کی سوچ میں کہی نہ کہی یکسانیت ضرور ہوتی ہے۔ انسانی شعور کی اس قدر کی بے پناہ تخلیقی قوتوں کو دیکھ کر عقل دھنگ رہ جاتی ہے۔ ہم ان ہی روایتی تخلیق سرچشموں سے محظوظ بھی ہوتے ہیں اور فیضان بھی حاصل کرتے ہیں۔ انسانی تہذیب وتمدن اپنی اساس ان ہی بنیادوں پر کھڑا کرتی ہے اور یہی روایتی قدریں بعد میں ہماری ثقافت اور تمدن کا روپ دھار لیتی ہے۔ یہی سینہ بہ سینہ یا زبانی چلنے والی قدریں Folk Lore، لوک ادب کہلاتی ہیں۔

لوک ادب کا مطالعہ سماجیات، نسلیات، لسانیات، قوموں کے تہذیبی لین دین اور اس نوع کی دوسری چیزوں کو سمجھنے اور تاریخی ارتقاء کی گرہیں کھولنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کشمیری لوک ادب کے ذریعے ان ہی چیزوں کو سمجھنے کیلئے ریاستی کلچرل اکیڈمی نے ''ہمارا ادب'' کا ''لوک ادب نمبر'' ۷۷-۱۹۷۶ء میں شائع کیا۔ اس شمارے میں سب سے پہلا مضمون پروفیسر محی الدین حاجنی کا ''کشمیری زبان کے نثری لوک ادب کا خاکہ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ حاجنی صاحب لوک ادب کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

''کسی قوم کی ادبی تاریخ کا سرسری جائزہ لینے کے بعد ہی ہمیں اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے ادب میں کچھ ایسی ادبی روایتیں (جنہیں ہم ادبی سرمایہ بھی کہہ سکتے ہیں) موجود ہیں جو متواتر

زبانی اور سینہ بہ سینہ چلتی آئی ہیں۔ اور لوگ خواب و خیال کی دُنیا میں سانس لینے کے خاطر اکثر اسی روایتی دُنیا میں پناہ لیتے ہیں۔ نثر ہو یا نظم، اس صنف سخن میں رہنے سہنے سے لے کر ان کے ارمانوں کی دُنیا تک اس کا اپنا مزاج ہوتا ہے، اور اس طرح پہلی ہی نظر میں یہ دوسرے اصناف سے الگ دکھائی پڑتی ہے۔ اگر اس صنفِ سخن کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو کسی خاص قوم کی ابتدائی تاریخ سے لے کر ان کے اجتماعی شعور کے خاکوں تک ہر چیز سانس لینے لگتی ہے۔ ادب کی یہی صنف لوک ادب کہلائی جاتی ہے۔''

اپنے فرصت کے لمحات کو خوشی خوشی کاٹنے کے لئے انسان نے قصہ پیدا کیا۔ دن کا تھکا ہارا انسان، جب رات کو گھر پہنچتا تو کسی بھی حالت میں یاروں دوستوں یا پھر ہمسائیوں کی محفل میں جاتا، وہاں اپنی کہتا اور دوسروں کی سُنتا۔ ہر کوئی کہنے والا چاہتا تھا کہ توجہ کا مرکز بنا رہے۔ اسی رجحان نے قصے کو جنم دیا۔ زبان و بیان کے اعتبار سے جو قصہ عصری تقاضوں کو پورا کرتا وہی قصہ زیادہ ترقی کرتا۔ ان قصوں میں اُن قوموں کی تاریخ ہوتی اور اُن کے جینے کے روّیے ہوتے تھے۔ ان قصوں میں تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی بو باس ہوتی تھی۔ خیر آج کا سائنسی دوران باتوں کی فرصت نہیں دیتا۔ لیکن آج بھی اُن زمانوں کو سمجھنے کیلئے یہ قصے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ قصے زیادہ تر سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچے اور یہی قصے اصل میں لوک ادب ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف رجحانات نے قصوں میں راہ پائی۔ لیکن زیادہ تر قصوں میں مافوق الفطری اور اساطیری عناصر ہی چھائے رہے۔ محیر العقل کردار ہمیشہ انسان کی ذہنی تسکین کرتے تھے۔ یہی کردار آج اساطیری کردار کہلاتے ہیں۔ کشمیری نثری لوک ادب کو مختلف ادوار میں کن رجحانات نے متاثر کیا؟ پروفیسر حاجنی اس بارے میں رقمطراز ہیں۔

"یہ باطنیت کے اسی رجحان کا اعجاز تھا کہ ہمارے ادب میں دیو مالائی عنصر ایک طرف سے اور فلسفہ دوسری جانب سے داخل ہوا۔ جس نے کبھی جادو، کبھی تو ہم پرستی اور کبھی دوسرے ایسے ہی عناصر کا روپ دھار لیا۔ مختلف جہتوں نے مل کر، یکسر ہمارے لوک ادب کو مافوق الطبعی مزاج بخش دیا۔"

اس مضمون میں آگے چل کر پروفیسر حاجنیؔ صاحب اُن تمام حالات و واقعات اور رجحانات و محرکات کا ذکر بڑے دلکش اور مورخانہ انداز میں کرتے ہیں، جنہوں نے وقتاً فوقتاً کشمیری لوک ادب کو اپنے سائیوں میں لپیٹ کر اسکی تہذیب بھی کی اور اس کا رخ متعین کرنے کی کوشش بھی کی۔ کشمیری قوم کی اپنی روایات، پھر بودھ مت کے زیر اثر لوک ادب میں بدلاؤ، مغلوں کی ہندوستان آمد اور اسلام کے اثر کے ساتھ ایرانی علوم کی کارفرمائیوں سے لوک ادب کی نئی جہتوں کا سامنے آنا، پھر سکھوں اور ڈوگروں کے دور میں کشمیریوں کا ظلم و جبر سے تنگ آکر تصوراتی دنیا کی تعمیر میں مصروف رہنا۔ اسی طرح کشمیری لوک ادب میں رائج مختلف تلمیحات اور کشمیر کے لوک ادب میں پہیلیوں کا مقام، ان سبھی امور پر پروفیسر حاجنیؔ نے سیر حاصل تبصرہ کر کے حقائق کی گرہیں کھول دی ہیں۔ ایرانی علوم اور ادب کے زیرِ اثر کشمیری لوک ادب میں ہوئی تبدیلیوں کا تذکرہ پروفیسر حاجنیؔ نے اس طرح کیا ہے۔

"ایسی بن کھلی آرزؤں پر ایرانی ادبیات نے نازک پچکاری کا کام کر لیا، جس کی جلو میں لوک ادب کا جناتی تصور روز بروز بڑھتا ہی رہا۔ چنانچہ آج بھی

ہمارے لوک ادب میں بار بار اس بات کا تذکرہ ملتا ہے کہ پربتوں میں پریاں، ویرانوں میں دیو، سیلابی جگہوں پر مشران .... مختصراً گھروں کے اندر بھوت اور گھروں کے باہر پچھلے پائیوں کا یہ راج ہمارے لوک ادب کا مستقل عنوان بن گیا ہے۔"

کشمیر میں ایک بڑی غفلت لوک ادب کے معاملے میں یہ ہوئی کہ یہاں کے داستان گویوں نے کچھ انتہائی حساس اور تاریخی اہمیت کی حامل شخصیات کو اساطیری رنگ دے کر اُن کی زندگیوں کے متعلق حقائق کے ساتھ کھلواڑ کیا ہے۔ اس تاریخی کھلواڑ کی زد میں لل دید اور حضرت شیخ العالم جیسی شخصیات بھی آئی ہیں۔ حبہ خاتون کی زندگی کو تو یہاں کے لوگوں نے چیستاں بنا ڈالا ہے۔ اس بارے میں ایک جگہ پروفیسر حاجنی لکھتے ہیں۔

"ہمارے گاؤں کے قصہ خواں اب تک بھی اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ حبہ اور یوسف شاہ میاں بیوی تھے، کیونکہ وہ پورے عقیدے کے ساتھ یہ بات دُہراتے ہیں کہ یہ دونوں بہن بھائی تھے۔ جنہوں نے دوتھ ماج کا دودھ پیا تھا اس لئے یہ آپسمیں شادی کر ہی نہیں سکتے تھے"

لوک ادب کے متعلق یہ مضمون اپنے اندر ایک مثالی مضمون ہے۔ اس مضمون کے آخر پر پروفیسر حاجنی کشمیری لوک ادب کا مقام اس طرح متعین کرتے ہیں۔

"فقط کہاوتوں کا سرسری مطالعہ کرنے پر سر جارج گریرسن جیسے محقق یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ "دنیا میں بہت کم ایسے ملک ہوں گے جن کی

زبانوں میں عقل وفراست کی اتنی کہاوتیں محفوظ ہوں گی جتنی کہ کشمیری

زبان میں ہیں۔"

اس مضمون میں پروفیسر حاجنی نے سادہ اور آسان زبان استعمال کی ہے۔ زبان میں کوئی لوچ اور الجھاؤ نہیں ہے۔ زبان موضوع کی مناسبت سے استعمال کی گئی ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجنی نے موضوع کے ساتھ بھرپور انصاف کیا ہے۔ اسی عنوان کے تحت پروفیسر حاجنی نے انگریزی میں ایک مضمون تحریر کیا ہے۔ وہ مقالہ بنیادی طور پر "پرتاب" میگزین میں شائع ہوا تھا اور اس کو ۲۰۱۵ء میں حلقہ ادب سوناواری کی طرف سے چھاپی گئی Discourses of Prof. Mohi U Din Hajini نامی کتاب میں شائع کیا گیا ہے۔ کشمیری زبان میں بھی اس موضوع پر اُن کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔

علامہ اقبالؒ اور حلاج

پروفیسر حاجنیؔ اصل میں عربی کے عالم تھے۔ عربی انہوں نے درساً پڑھی تھی۔ کشمیری زبان کی لسانی تحریک کے روح رواں تھے۔ انگریزی پر اُن کو ماہرانہ دسترس تھی اور اردو سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان تمام زبانوں میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس بھی زبان میں انہوں نے قلم اٹھایا، قطروں کو قلزم بنادیا اور فصاحت وہ زبان و بیان میں تلاطم پیدا کر دیا۔ یہ کمال ہر ادیب کو حاصل نہیں ہوتا ہے۔

حلاج کے بارے میں پروفیسر حاجنیؔ نے ابتدائی جانکاری کشمیر کے داستان پرور ماحول میں ہی حاصل کی تھی۔ لیکن اُن کے ساتھ حاجنیؔ کا حقیقی تعارف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لٹن کتب خانے کے سبحان اللہ سیکشن میں ہوا۔ اس کے بارے میں اُن کا کہنا ہے۔

> ''راقم الحروف نے طالبِ علمی کے دوران مطبوعہ کتاب الطّواسین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ (سبحان اللہ سیکشن) میں پائی اور پوری کتاب دسمبر ۱۹۴۰ء میں نقل کر لی''

علامہ اقبال برصغیر کے بہت عظیم شاعر ہیں۔ محی الدین حاجنیؔ کی عمر اُس وقت تقریباً بیس سال ہوتی جب علامہ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ یعنی اقبال کا زمانہ حاجنیؔ نے خود دیکھا تھا۔ پھر شاعر مشرق اور شاعر اسلام ہونے کی وجہ سے حاجنیؔ کو ان سے عقیدت بھی تھی اور محبت بھی۔

منصور الحلاج کے عارفانہ اور صوفیانہ اقوال نے محی الدین حاجنیؔ کو علی گڈھ میں متاثر کیا جبکہ اقبال کے فکر و فلسفہ سے وہ پہلے ہی متاثر ہو چکے تھے۔ مشرق کی ان دونوں ہستیوں کی آ گہی کا محور و مرکز عشق رسول ﷺ تھا۔ اور دونوں دنیا میں اسلام کو سر بلند دیکھنا چاہتے تھے۔ پروفیسر حاجنیؔ بھی ایک سچے عاشقِ رسولؐ تھے اور اسلامی تہذیب و تمدن کے دلدادہ۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ اسلام کا بول ہمیشہ بالا رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اقبالؔ اور حلاج کے فکر و فلسفے کا ایک تقابلی مطالعہ کیا۔ یہ تقابلی مطالعہ ۱۹۷۸ء میں ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے اقبال صدی تقریبات کے سلسلے میں شایع کئے گئے خصوصی رسالے ''محفلِ اقبال'' میں شائع کیا گیا۔ ''محفل اقبال'' کے پیشِ لفظ میں اس کے ترتیب کار پروفیسر رشید نازکیؔ لکھتے ہیں۔

> ''چنانچہ اقبال صدی تقریبات کے ہی دوران اقبال کی تقریباً تمام اہم تخلیقات اور کشمیر سے متعلق اُن کے پورے کلام کا ترجمہ کشمیری زبان میں ہوا۔ اس کے علاوہ سرینگر اور جموں میں شاعر کے فن، فکر اور پیام کا فیض عام کرنے کی خاطر دو عظیم الشان سمینار بلائے گئے۔ جن میں تقریباً ملک کے تمام گوشوں سے آئے ہوئے اقبال شناس دیدہ وروں نے شرکت کی، زیرِ نظر مجموعے کے اکثر مضامین جموں کے اقبال سمینار میں پڑھے گئے ہیں۔''

اُبالعغیث حسین ابن علی المنصور الحلاج تیسری صدی ہجری کے ایک بلند پایہ صوفی بزرگ ہیں۔ مسلم اکثریتی علاقوں کے علاوہ اقلیتی علاقوں میں بھی اُن کے معتقدات نے ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا۔ جس کے آثار آج تک کشمیری اور ایرانی ادب میں پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے اُن کی زندگی کو چیستاں بنا ڈالا۔

اُن کے اقوال کے مجموعے ''کتاب الطّواسین'' کی پروفیسر محی الدین حاجنیؔ نے تشریح کی ہے۔ جو اُن کا بہت بڑا کارنامہ مانا جاتا ہے۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کشمیری النسل ہے۔ اُن کے جد کشمیر سے ہی ہجرت کر کے لاہور چلے گئے۔ کشمیر کے جنت نما مناظر سے اقبال کا تعلق جسم اور جان کا رہا ہے۔ لیکن اقبال کے فکر وفن کو عام کرنے کے معاملے میں ۱۹۷۶ء تک کشمیریوں کا حصہ بالکل نہ ہونے کے برابر تھا۔ اقبال صد سالہ تقریبات کے دوران دُنیا کے دیگر مما لک کے علاوہ ہندوستان اور کشمیر میں بھی اُس عظیم شخصیت کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے فکر اور فلسفے کو عام کرنے کے لئے سینکڑوں پروگرام منعقد کئے گئے۔ اقبال صدی کے دوران کشمیریوں نے سمیناروں، مباحثوں اور مشاعروں کے ذریعہ، اقبال کیلئے وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کیں، جو وہ اقبال کیلئے کر سکتے تھے۔ اسی دوران جموں اور سرینگر میں شاعر کے فن اور فکر اور پیام کا فیض عام کرنے کی خاطر دو عظیم الشان سمینار بلائے گئے۔ ان سمیناروں میں پڑھے گئے مقالوں کو ۱۹۷۸ء میں جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگوئجز نے کتابی صورت میں ''محفل اقبال'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب میں دوسرا ہی مضمون پروفیسر محی الدین حاجنیؔ کا ''علامہ اقبال اور حلاج'' کے عنوان سے ہے۔

حلاج اور اقبالؒ کے درمیان تقریباً دس صدیاں حائل ہیں۔ حلاج کی پوری زندگی کے حالات زیادہ تر قیاس آرائیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اقبال کافی خوش قسمت ہیں۔ حالانکہ تاریخ

پیدائش میں کوئی تضاد ہو بھی، لیکن اُن کی زندگی پر اتنی تحقیقیں ہو چکی ہیں کہ اُن کی زندگی کا ہر گوشہ ہمارے سامنے عیاں ہیں۔ جبکہ المنصور الحلاج کی زندگی ترقی کی اتنی منزلیں طے ہونے کے بعد بھی پردۂ راز میں ہے۔ حلاج کے بارے میں حاجنیؒ صاحب رقمطراز ہیں۔

''ہمارے اکابر علماء نے حلاج کی شخصیت کو تین مختلف رویوں میں پیش کر دیا۔ ابو یوسف فروینی (وفات ۱۴۰۶ء) مصنف ''اخبار الحلاج'' سے لے کر ابن خلدون (وفات ۱۴۰۶ء) تک ابتدائی تین صدیوں کے اندر اندر ہی حلاج کی شخصیت ایک چیستاں میں بدلتی گئی۔ اگر ایک طرف حضرت عطار (وفات ۱۲۲۳ء) مصنف ''حلاج نامہ'' اور مولانا رومی (وفات ۱۲۷۳ء) نے حلاج کو علم و عرفان کا ستون تصور کر لیا۔ تو دوسری طرف علامہ ابن تیمیہ (وفات ۱۳۲۸ء) نے ''فتویٰ فی رّدِ الحلاج'' کے ذریعہ حلاج کی صوفیانہ حیثیت کو ہی کلی طور زائل کرنے کی کوشش کی۔ ان دو انتہا پسند گروہوں کے درمیان نصیر الدین طوسی (وفات ۱۲۷۳ء) اور محمود شبستری (وفات ۱۳۹۴ء) نے اگر چہ حلاج کی بے لاگ تنقید بھی کی۔ لیکن پھر بھی اکثر معترضین حلاج کے عرفان کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ ان متضاد روایات کے مشاہدے پر ہی علامہ اقبال کو کہنا پڑا کہ۔

رقابت علم وعرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی

کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا''

ہر عظیم شخصیت کو اپنی عظمت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ اگر شخصیت بادۂ عرفان سے سرمست وسرشار ہو تو اُس کو بہت دور کی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔ اپنے متعلق پہلے ہی کہہ جاتے ہیں کہ کیا ہوگا؟ علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی تصدیق تو حلاج نے اپنے ہی زمانے میں کی تھی۔ کہتے ہیں۔ ترجمہ

''یعنی جو عالم ناسوت (دائرہ اُولی) میں رہتے ہوئے بھی مجھے دیکھ ہی نہ سکا۔ اس نے میرا نام زندیق رکھا اور جو عالمِ کشف (دائرہ دوئم) سے واقف ہوا۔ اس نے مجھے عالم ربانی گمان کیا''

اگر اس مضمون میں صرف میں منصور حلاج کی زندگی کا تذکرہ کرنے بیٹھ جاؤں، تو نہ ہی مقالہ مکمل ہوگا اور نہ ہی منصور کی زندگی حقیقت اور مبالغے کے پردوں سے باہر آئی گی۔ اگر منصور اور اقبال کی تصنیفات کا تقابل غرض ہو۔ تو پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ جہاں اقبال کی تقریباً ساری تصنیفات اُن کی زندگی میں ہی کئی کئی بار شائع ہوئی اور اقبال پر اُن کی زندگی میں ہی کئی کتابیں لکھیں گئیں اور آج تک یہ سلسلہ بہت بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ وہی منصور کی ۴۲ تصنیفات میں سے ۴۱ اُن کی زندگی میں ہی تلف کر لی گئی۔ اور زمانے کی دست و برد سے صرف ایک کتاب ''کتاب الطّواسین'' بچ نکلی۔ جس کے متعلق بحث اس کتاب میں ہو چکی ہے۔

جہاں تک منصور اور اقبال کے نظریات کا تعلق ہے۔ ان میں بہت حد تک مماثلت نظر آتی ہے۔ جسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال اور منصور الحلاج کے فکری ماحول میں قریب قریب مطابقت تھی۔ دونوں کے زمانوں میں مختلف علوم کا ٹکراؤ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں جو مختلف رجحانات اور تحریکات چلیں۔ انہوں نے مذاہب کے ماننے والوں کو دم بخود کر دیا۔ اور اس کے ردِ عمل میں مذہب بیزاری کا ایک زبردست رجحان شروع ہوا۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ نے اس مذہب بیزاری کا وہی علاج پیش کر دیا جو حلاج نے اپنے زمانے میں پیش کیا تھا۔

پروفیسر حاجنیؔ کا مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں انہوں نے حلاجؔ اور اقبالؔ کی زندگیوں کے بارے میں تاریخی شواہد کی بنیاد پر بات کی ہے۔ اس حصے میں وہ اقبالؔ کو خوش قسمت قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اُن کی زندگی کی ایک ایک بات عوام تک صاف صاف اور عیاں پہنچی ہے۔ جبکہ حلاج کی برگشتہ طالعی یہ رہی کہ جس کے من میں جو آیا، اُن کے متعلق لکھ ڈالا اور ایک حقیقی تاریخی کردار کو اساطیری بنا ڈالا۔ اس حصے میں اُن اثرات کی تھوڑی بہت نشاندہی بھی کی گئی ہے جو اقبالؔ نے حلاج سے قبول کئے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں۔

> ''حلاجؔ کے تتبوع میں علامہ اقبال نے جاوید نامے میں صرف چار طواسینِ نبوت (طاسین گوتم، طاسینِ زرتشت، طاسینِ مسیح، طاسینِ محمدﷺ) باندھے ہیں اور اپنی جولان گاہ چار انبیاء کرامؑ کی تعلیمات تک ہی محدود رکھی ہے۔ لیکن اس تتبع کے علاوہ علامہ مرحوم نے باقی تخلیقات میں متعدد بار حلاجؔ کے عقائد اور نظریات کا حوالہ شاعرانہ یا متصوفیانہ طریقے پر دیا ہے۔''

مقالے کے دوسرے حصے میں اُن خیالات کے ساتھ بحث کی گئی ہے جو حلاجؔ اور اقبالؔ میں مماثل ہیں۔ پروفیسر حاجنیؔ نے اس بحث میں ''خودی'' اور ''انانیت'' کو اسک دوسرے کے مترادف قرار دیا ہے۔ اُن کے نزدیک یہ ایک سکے کے دو پہلو ہیں۔ فرماتے ہیں۔

> ''حلاج نے ''انانیت'' کا سہارا لیا اور علامہ نے ''خودی'' کا۔ جو تجزیاتی نکتہ نگاہ سے دراصل ایک چیز کے دو نام ہیں۔ غفلت زدہ دانشوروں کے لئے یہ دونوں چیزیں یا ماوراءادراک تھیں یا محض توہم۔''

پروفیسر حاجنی مرحوم نے اپنے اس مقالے میں اقبال اور حلاج کے مماثل خیالات پر بڑی خوبصورت بحث کی ہے۔ ابلیس، انسان کا مقام، عرفان، عقل و عشق، تسخیر کائنات ،روح اور راہ نجات کے متعلق دونوں کے خیال میں کہاں کہاں مشابہت ہے اور کہاں کہاں علامہ مرحوم نے حلاج کی اتباع کی ہے۔اس پر حاجنی صاحب نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

پروفیسر حاجنی نے اس مقالے میں جس طرح سے دونوں روحانی شخصیات کے افکار و نظریات کا غائر جائزہ پیش کیا ہے، اُس سے اسلامی اور روحانی علوم کے ساتھ اُن کی گہری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔اقبال شناس ہونے کے ساتھ ہی اُن کے منصور شناس ہونے کا بھی یہ مقالہ ایک ثبوت ہے۔''معرفت'' کے بارے میں ان دونوں کے افکار کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''حلاج اپنے ماحول اور اپنے نظریات کے عواقب سے سراسر بے نیاز رہ کر اپنے روحانی تجربات پیش کرتے رہے۔
>
> ''معرفت ایک چیز ہے۔ جو جہات، علّات اور مادی آلات سے بہت پہلی تھی۔ پھر جہات اس کو کیسے سمو سکیں گے اور منطقی نہایات اس کے ساتھ کیسے ملحق ہوسکیں گیں'' (طاسین المعرفتہ)
>
> یعنی جو منظور تک واصل ہوا۔ وہ نظر سے بے نیاز ہو گیا (منصور)
>
> لیکن علام اقبال نے ماحول کی پوری عکاسی کے ساتھ ساتھ خاص موضوع پر ہی اپنے روحانی تجربات پیش کر دئے اور اپنی طرف سے حتیٰ الامکان اسلوبِ کلام میں احتیاط سے کام لیا۔
>
> ازاں ترسم کہ پنہانم شود فاش
> غمِ خود را نگویم با دِلِ خویش''

اس طرح اس پورے مقالے میں پروفیسر حاجنی نے منصور حلاج اور علامہ اقبال کے

افکار کا موازنہ کر کے ایک بہت بڑا علمی کارنامہ انجام دیا۔ مقالے کے آخر میں اتباعِ رسولؐ کو نجات کا واحد ذریعہ قرار دے کر اس کے متعلق دونوں کے نظریات میں یکسانیت تلاشتے ہوئے پروفیسر حاجنیؔ لکھتے ہیں۔

"چنانچہ علامہ مرحوم کے مجموعی انداز فکر کو جب ہم کتاب الطّواسین کے مضمنات سے غائیر موازنہ کریں گے۔ تو صاف نظر آیئے گا کہ دونوں کے نزدیک عرفانِ ذات کا واحد وسیلہ یہی اتباع رسولؐ ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح قلم تیرے ہیں"

جہاں تک اس مقالے کے اسلوب اور دیگر خصوصیات کا تعلق ہیں۔ مقالے کی زبان عمدہ علمی زبان ہے۔ مقالے میں تسلسل کے ساتھ افکار اقبال و منصور پر بحث کی گئی ہے۔ اس حوالے کے ذریعے ہم آسانی سے دونوں بزرگوں (حلاج اور اقبال) کے شعری افکار و تجربات کو سمجھ پاتے ہیں۔ میری نظر میں یہ مقالہ پروفیسر حاجنیؔ کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔

آگ اور مرزا عارف کی ایک رباعی

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ پروفیسر محی الدین حاجنی عربی کے اُستاد تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم پر بھی اُن کی گرفت مضبوط تھی۔ سائنس، جغرافیہ، ہسٹری، ریاضی، علمِ بشریات اور ارضی اور فلکی علوم بھی حاجنی صاحب جانتے تھے۔

پروفیسر حاجنی ایک شاعر بھی تھے اور نقاد بھی، نقاد ایسے کہ جی نے چاہا تو کسی کو آسمان پر بٹھا دیا اور نہ تو زمین میں گاڑ دیا۔ اس کی وجہ اُن کا مزاج تھا۔ اُن کے منفرد مزاج نے ہمیشہ اُن کی تنقید کو متاثر کیا۔ حاجنی صاحب ایک مکمل مترجم اور مفسر بھی تھے۔ اس سلسلے میں ''کتاب الطّواسین'' نثر کے میدان میں اور ''مسدس حالی'' شاعری کے میدان میں اُن کی دین ہے۔ حاجنی صاحب دوسرے شعراء کی غزلوں، اشعار اور رباعیات کی تشریح بھی بڑے دلکش انداز میں کرتے رہے۔ وہاب حاجنی کی غزلوں اور وژُن [1] کے انہوں نے ایسے ترجمے کئے کہ عام قارئین ہی نہیں بلکہ علماء و فضلاء بھی پڑھنے کے بعد دھنگ رہ گئے۔ کسی کے اشعار کی شرح لکھنا کوئی اُن سے سیکھے۔ اس میدان میں اُن کا شاہکار مرزا عارف کی ایک کشمیری رباعی کی اردو شرح ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر حاجنی صاحب نے مرزا عارف کی رباعی کی شرح اس طرح کی ہے کہ کشمیر کے سائنس داں مرزا عارف نے جب دیکھا ہوگا تو یقیناً حیران ہوئے ہونگے۔ پروفیسر حاجنی کا یہ مضمون ''گلریز'' کے جولائی ۱۹۵۴ء کے شمارے میں ''آگ اور

---

[1] ''وژُن'' کشمیری کی ایک اہم شعری صنف ہے۔

مرزا عارف کی ایک رباعی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ پروفیسر حاجنی اس مضمون کی ابتداء ہی بڑے عالمانہ انداز میں کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں ۔

''ماہرین طبقات الارض نے مشہور فرانسیسی ہیئت دان لاپلاس کی پیش کردہ مفروضہ سحابیہ Nebular Hypothesis سے شاید اشارہ پاکر کرّہ ارضی کی ابتداء سے متعلق یہ انکشاف کیا ہے کہ آج سے کم از کم دوارب سال پہلے ہماری زمین نہ صرف ایک سحابیہ 'Nebula' تھی۔ بلکہ آتش فشانی میں یہ گیس سورج سے کسی صورت میں سرد تر نہیں تھا۔ مرور زمانہ کے ساتھ گیس مائع کی صورت اختیار کر چکا، اور مائع ٹھوس شکل میں منتقل ہوا۔ اور بالآخر ہزار ہا ارتقائی منازل طے کر کے جرثومہ اول اشرف المخلوقات بنا ''

جہاں تک آگ کا تعلق ہے کچھ قوموں نے آگ کی عبادت کی اور کچھ اقوام نے اس سے نفرت کی۔ آگ کی تاریک کے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات مختلف رہے ہیں۔ دنیا کے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے مفکروں اور دانشوروں نے آگ کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُن سبھی پر پروفیسر محی الدین حاجنی نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ آگ کو بنیاد بنا کر نور و ظلمت کے اسرار کی نقاب کُشائی بھی اس مضمون میں پروفیسر حاجنی صاحب نے کی ہے۔

اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ میں آگ کی سائنسی، مذہبی اور سماجی تاویلات پیش کر کے پروفیسر حاجنی نے اپنی علمی استعداد اور گہرائی کا ثبوت دیا ہے۔ دوسرے حصے میں اصل رباعی کی شرح کی گئی ہے۔ اس شرح میں پروفیسر حاجنی کے ایک مکمل شارح ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

مضمون میں عالمانہ تمہید کے بعد حاجنی صاحب نے رباعی کے اشعار کی تشریح کی ہے۔

تشریح کے بعد سائنس، جغرافیہ اور مذہب کو بنیاد بنا کر اس رباعی کی پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ رباعی کی شرح کے دوران سائنسی اور استدلالی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ایک جگہ ایک سائنس داں کی طرح پروفیسر حاجنیؔ آگ کی ماہیت اور حقیقت سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں

> ''جب ہم کہتے ہیں کہ زید کا ہاتھ آگ سے جل گیا۔تو اس سے یہ مراد ہے کہ آگ کے تیز رفتار سالمات نے ہاتھ کے کم رفتار سالمات کو اپنی رفتار پر کھینچنے کی کوشش کی اس کھینچا تانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ کے مادی اجزاء کی قدرتی ترکیب بگڑ گئی۔عنصری اجزاء کی اس پریشانی سے اعصاب انسان مشتعل ہوئے اور یہی اشتعال یا ہیجانِ اجزاء دماغ میں جلن کا خیال (Sensation) پیدا کرتا ہے۔''

اس طرح حاجنیؔ صاحب نے مرزا غلام حسن بیگ عارفؔ مرحوم کی رباعی کی ایسی تشریح کی کہ لوگ کیا مرزا بھی دیکھتے رہے ہونگے۔اس تنقیدی مضمون میں پھر حاجنیؔ کے مزاج کا دخل نظر آتا ہے۔انہوں نے چاہا تو عارف کی رباعی کو بہت دور کے جامے پہنا دیئے۔دوسری بات یہ کہ آج قاری کو احساس ہوتا ہے کہ حاجنیؔ صاحب نے رباعی کی آڑ میں اصل میں اپنی علمی بصیرت کا لوہا منوانا چاہا ہے۔اور وہ اس میں بالکل کامیاب بھی ہوگئے ہیں۔اس مضمون کی زبان عام فہم، صاف اور شگفتہ ہیں۔یہ مضمون ایک Informative Guide سے کچھ کم حیثیت نہیں رکھتا۔جسمیں تاریخ، مذاہب، اعتقادات، اور سائنس کے علاوہ ادب عالی کے نمونے ایک ساتھ پڑھنے کو ملتے ہیں۔

فصلِ سوم

تخلیق کار رحا جنی

پروفیسر حاجنی

کی انشائیہ نگاری

جب بھی افسانوی ادب کے بارے میں بات کی جاتی ہے، تو سب سے پہلے قصہ ہماری نظروں کے سامنے رقص کناں ہو جاتا ہے۔ فرصت کے ایام میں قصے کہے اور سُنے جاتے تھے۔ بے فکروں کو جب وقت گذاری کے شغل نہ سوجھتے تھے، تو وہ قصوں کی دنیا آباد کر کے ان ہی میں پناہ لیتے تھے۔ بادشاہت اور خاندانی راج کے عروج کے زمانے میں بادشاہوں نے داستان کے دامن کو پکڑ لیا۔ سلطنت چاہیے ہاتھ سے جائے لیکن داستان ساتھ رہے۔ سبھی لوگ، امیر غریب، بادشاہ رعایا اس زمانے میں داستان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر تھے۔ لیکن زمانہ جاگنے لگا تو لوگوں نے داستانوی دُنیا کو خیرباد کہہ کر حقیقت کی دُنیا آباد کر لی۔ اس حقیقت نگاری میں بھی قصہ زندہ رہا۔ لیکن ناول کے روپ میں۔ اختصار، تسلسل اور حقیقت ناول کے بنیادی اوصاف ٹھہرے۔ صنعتی انقلاب نے جہاں انسان کی زندگی کو آسان بنا دیا اور آرام آسائش کی سبھی چیزیں میسر رکھ دیں۔ وہی اس کی فرصت کو بھی مشینوں نے ہضم کر لیا۔ اب ناول کیلئے وقت کہاں تھا تو قصہ کو اور مختصر کر کے افسانے کے روپ میں پیش کیا گیا۔ افسانہ کے لئے یہ لازمی شرط ٹھہری کہ یہ حقیقی زندگی کی عکاسی اور ترجمانی کرتا ہو۔ علاوہ ازیں قصہ کی ترتیب اور تکمیل افسانے کے صوری لوازم ہیں۔ کج روزمانے نے کج رو چیزوں کی فرمائش کی۔ صنعتی انقلاب نے دنیا میں پیچ وخم پیدا کئے۔ اب جب انسانی زندگی میں ہی ترتیب اور تنظیم نہ رہی تو انسان کی پیدا کردہ چیزوں میں اس کو تلاش کرنے کا کیا فایدہ۔

ان ہی حالات میں ادب کی ایک کج رو اور پیچ وخم والی صنف پروان چڑھی۔ اس صنف کو انشائیہ کہتے ہیں۔ انشائیہ نثری اظہار کی ایک ایسی صنف ہے جس میں حقیقت کا اظہار شخصی ردعمل کے طور پر ہوتا ہے۔ عدم تکمیل، رمزیت واشاریت، غیر منطقی ربط اور اختصار اس صنف

کے امتیازات ہے۔ یہ صنف قاری کو عجیب وغریب انداز میں دعوت فکر دیتی ہے۔ اس صنف کا ایک اہم وصف مسرت بہم پہنچانا ہے۔ انشائیہ میں زبان وبیان میں بانکپن اور مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتوں کا ذکر جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

انشائیہ فرانسیسی زبان کی پیداوار ہے۔ آدم دی مون تین نے اس صنف کی ابتداء کی۔ فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے یہ اُردو میں وارد ہوئی۔ اُردو میں اس کے ابتدائی نقوش سرسید احمد خان کے یہاں ملتے ہیں۔ لیکن اپنے تمام فنی محاسن کے ساتھ انشائیہ ایک منفرد صنف کی حیثیت سے بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں سامنے آیا۔ اس زمانے میں کشمیر کے بہت سارے قلمکار اپنے تجربات، مشاہدات اور احساسات کے اظہار کیلئے مختصر نثری اصناف کو ذریعہ اظہار بنا رہے تھے۔ افسانے کی صنف مقبول نثری صنف تھی۔ انشائیہ کو شاید ہی کوئی قلمکار ذریعہ اظہار کے طور پر برتتا تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے ختم ہوتے ہی جب ملک کے دوسرے حصوں میں انشائیہ نگاری کا رواج ازسرنو شروع ہو رہا تھا۔ تو کشمیر کے چند قلمکاروں نے بھی اس میدان میں اپنے ہاتھ دکھانے شروع کر دیئے۔ ان ہی قلمکاروں میں پروفیسر محی الدین حاجنیؔ بھی ایک نام ہیں۔ جنہوں نے کچھ انشائیے لکھ کر اس میدان میں اپنا نام امر کر دیا۔ اُن کی قلمی کاوشوں کا اعتراف ''کشمیر میں اردو'' کے مصنف پروفیسر سروریؔ اس طرح کرتے ہیں۔

> ''تصنیف وتالیف کے میدان میں اس وقت جو علماء اور اہل قلم ہیں۔ ان میں پروفیسر محی الدین حاجنیؔ بڑی متنوع دلچسپیوں کے حامل ہیں۔ وہ عربی کے پروفیسر ہیں، کشمیری تحریک کے علمبردار اور اُردو اور کشمیری دونوں میں یکساں سہولیت کے ساتھ قلم سنبھال سکتے ہیں۔''

پروفیسر سروریؔ آگے رقمطراز ہیں۔

''پروفیسر حاجنؔی اُردو میں بے شمار مقالات اور مضامین کے مصنف ہیں۔اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے وہ اچھے انشائیہ نگار اور کسی حد تک مزاح نگار بھی ہیں۔''

ایک عربی مقولے کے مطابق انسان ہنسنے والا جاندار ہے۔ ہنسنا اور ہنسانا انسان کی فطرت ہے۔ ہنسی کے ذریعے خوشی پھیلتی ہے۔اس لئے اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی اور ہنسانے کے نت نئے طریقے ایجاد ہوتے رہے۔ادب میں بھی ہنسنے ہنسانے کے طریقے وقت کے ساتھ ساتھ آتے رہے۔ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کے اصول بھی وضع کئے گئے۔ادب میں ہنسنے ہنسانے کے طریقوں کو ظرافت کہتے ہے۔ایک وقت ایسا بھی آیا جب ظرافت کیلئے بھی پیمانے مقرر ہوگئے۔ اعلیٰ درجے کی ظرافت اُسے ٹھہرایا گیا جو نہ ٹھہ ٹھہ ہنسائے اور نہ ہی قاری کو کھل کر مسکرانے پر مجبور کرے بلکہ اس کے ذہن کو گدگدائے اور ایک فرحت عطا کرے۔یہی اعلیٰ درجے کی ظرافت ہمیں محی الدین حاجنؔی کے انشائیوں میں ملتی ہے۔ اُن کے انشائیہ مزاحیہ ہیں۔جن کو پڑھ کر صرف دل کو فرحت ہوتی ہیں اور ہونٹ خاموش رہتے ہیں۔اُن کے مزاحیہ انشائیوں میں سے ایک ''بیوقوفی'' ہے۔اس انشائیہ میں حاجنؔی صاحب ''وقوف کے'' لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے منطقی دلیلوں اور یقین آفرینی کے ساتھ، عقل و دانائی کی باتیں نیم مزاحیہ انداز میں بڑی خوبی سے کہہ جاتے ہیں۔لفظ ''وقوف'' کی وضاحت پروفیسر حاجنؔی کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

''چنانچہ ''وقوف'' کو سکون کا مترادف مان کر، لغوی معنوں کی رو سے ہم متحرک چیز کو ''بے وقوف'' کہہ سکتے ہیں۔اس دلیل کے پیش نظر، مادی موجودات میں سے سوائے جمادات کے کوئی چیز ''باوقوف'' نہیں۔ بلکہ حالیہ جوہری تحقیقات کی بناء پر، جمادات بھی داخلی حرکت سے بے نیاز ہونے کے سبب ''بے وقوف'' ہی کہلائیں جائیں گے۔''

حاجنی صاحب نے اس مضمون میں انشائیہ نگاری کے تمام لوازمات کو دھیان میں رکھتے ہوئے ''بیوقوفی'' کو موضوع بنا کر دُنیا جہاں کی باتیں کی ہیں۔ اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پروفیسر حاجنی نے اس انشائیہ میں بھی سائنس اور نباتات و جمادات کو منطقی یقین اور دلیلوں کے ساتھ موضوع بحث بنایا ہے۔

پروفیسر حاجنی صاحب نے کئی انشائیے لکھے۔ اُن کا ایک اور دلچسپ اور مزاحیہ انشائیہ ''غلط فہمی'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس ایسے میں بھی حاجنی صاحب کا انداز وہی سنجیدہ مزاح کا ہے۔ مثلاً غلط فہمی لفظ پر بحث کرتے ہوئے حاجنی صاحب کہتے ہیں۔

> ''سطحی ملاحظہ پر یہ ظاہر ہے کہ ''غلط فہمی'' دو لفظوں سے مرکب ہے ''غلط'' اور ''فہمی''۔ لیکن آپ غلط کس واقعہ کو قرار دیں گے اور فہم کا کونسا مطلق اندازہ استعمال کر کے کہہ سکیں گے کہ سوچنے اور سمجھنے کا یہ معیار صحیح ہے اور باقی ذرایعے نادرست اور بفرضِ محال آپ صحتِ معیار پر قادر ہونگے بھی، تو بھی یہ انفرادی فیصلہ ہوگا، اجتماعی نہیں۔ کیونکہ آپ کے وسائل شعور میں آپ کی شخصیت سب سے زیادہ کارفرما ہے۔ جس کا ذاتی تقاضا یہ ہے کہ وہ باقی شخصیتوں سے ممتاز اور منفرد ہو۔''

پروفیسر حاجنی کے ان انشائیوں کی زبان صاف اور عام فہم ہے۔ ان انشائیوں میں حاجنی کی ظریفانہ سوچ اور انداز کا علم ہوتا ہے۔ اگر چہ اُن کے صرف دو ہی انشائیہ دستیاب ہوئے ہیں۔ پر ان ہی دو انشائیوں میں انہوں نے اعلیٰ درجہ کی ظرافت کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری کے تمام لوازمات کا لحاظ رکھا ہے۔ پروفیسر حاجنی کی ذہنی ترنگ اور انفرادی ہمہ رنگی نے ان انشائیوں کی شان دوبالا کر دی ہے۔ مختصراً یہ کہ پروفیسر حاجنی ہرفن مولا تھے۔ وہ جس

بھی میدان میں قدم رکھتے ، اپنے قلم کی جولانیاں دکھاتے ۔ اُن کے بارے میں محمد احسن احسن کا یہ کہنا " کہ حاجنی میدانِ ادب کے ایسے کھلاڑی ہیں جو ہر کھیل کو بخوبی کھیلنے کے علاوہ اپنے مزاج کے مطابق کھیلتے ہیں " بہت ہی صحیح اور برمحل معلوم ہوتا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر حاجنی

اور اردو صحافت

صحافت بنیادی طور پر نثر کا ہی ایک طاقتور شعبہ ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں اُردو نثر کی باضابطہ ابتداء انیسویں صدی کے آواخر میں اُس وقت ہوئی، جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۷۹ء میں اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ حالانکہ اس زبان کا بول بالا ریاست کے اطراف واکناف میں اس سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ کشمیر میں اُردو زبان میں تحریر کی روایت انیسویں صدی کے نصف آخر میں پروان چڑھی۔ 1882ء میں ریاست کا پہلا اُردو گزٹ بدیا بلاس شائع ہوا۔ لیکن اسے پہلے ہی کشمیر میں اُردو عام وخاص کی زبان بن چکی تھی۔ ہرگوپال خستہ نے 1872ء میں اُردو میں کشمیر کی پہلی تاریخ ''گلدستہ کشمیر'' کے نام سے لکھی۔ اس کتاب میں خستہ اُردو کی مقبولیت کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں۔

> ''گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگ اُردو بولتے ہیں اور ہانجیوں وغیرہ طائفوں کے لوگ سیاح سیلانیوں کے ساتھ اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں''

سرکاری سرپرستی کے بعد یہ زبان ریاست کی سماجی اور سیاسی زندگی میں موثر رول ادا کرنے لگی۔ چنانچہ تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں اور عدلیہ میں اسکے برتے جانے سے نہ صرف زبان میں وسعت پیدا ہوئی بلکہ اسکی اہمیت میں بھی اضافہ ہوا۔

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو شعروادب کی ترویج اور توسیع میں اخبارات اور رسائل کا سب سے زیادہ حصہ رہا ہے۔ غیرسرکاری طور پر ریاستِ جموں وکشمیر میں اُردو صحافت کا

باقاعدہ اور باضابطہ آغاز ۲۴ / جون ۱۹۲۴ء کو ملک راج صراف کے اخبار ''رنبیر'' کے شائع ہونے سے ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں پریم ناتھ بزاز کے ''وتستا'' کی اشاعت سے ریاست میں اُردو صحافت کے لئے نئے دروازے کھل گئے۔ اس کے بعد اخبارات اور رسائل کے شائع ہونے کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوا اور یہ سلسلہ آج تک شدومد سے جاری ہے اور انشاءاللہ آگے بھی جاری رہے گا۔

رسائل کی اشاعت بھی ریاست میں ''رنبیر'' کی اشاعت کے ساتھ شروع ہوئی اور آج تک شدومد سے جاری ہے۔ ریاست سے ہر سال اردو میں کوئی نہ کوئی رسالہ ضرور شائع ہوتا ہے۔ جو معروف رسائل جموں وکشمیر سے اُس زمانے یا پھر اُس کے بعد شائع ہوئے۔ اُن میں جموں کے 'پریم' اور 'فردوس' کے علاوہ کشمیر کے 'تعمیر'، 'جدید تعلیم'، 'سویرا'، دیہاتی دنیا'، 'کونگ پوش'، 'آزاد' اور کشمیر بزم ادب کا ترجمان گلریز' قابل ذکر ہیں۔

گلریز کی اشاعت ۱۹۵۰ء کے بعد سرینگر سے شروع ہوئی۔ اس رسالے نے بہت جلدی ریاست کے ادبی اور عوامی حلقوں میں اپنی پہچان بنائی۔ یہ رسالہ اصل میں ایک ادبی رسالہ تھا اور اس کے اکثر مضامین ادبی اہمیت کے ہوتے تھے، اس رسالے کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی کا کہنا ہے۔

> ''گلریز بڑا معیاری پرچہ تھا۔ سرینگر سے شائع ہونے والا یہ پرچہ کشمیری اور اُردو زبانوں کیلئے وقف تھا۔ اپنے محدود وسائل کے باوجود 'گلریز' نے یہاں کے ادبی رسائل میں منفرد جگہ بنالی تھی۔''[1]

اخبارات اور رسائل کی اشاعت سے وادی کے قلمکاروں کو لکھنے کا محرک ملا اور کئی نئے قلم کاران اخبارات اور رسائل کی بدولت سامنے آئے۔ اس طرح اخبارات کے اس سلسلے نے جموں وکشمیر کو بہت سارے قدآور اور بڑے صحافی دیئے۔ جنہوں نے جموں وکشمیر میں

---

[1] ''جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کی نشوونما'' از ڈاکٹر برج پریمی

اُردو زبان وادب کی تاریخ میں ہنگامہ خیز کارنامے انجام دیئے۔ اُن ہی ہنگامہ خیز صحافیوں میں ایک نام پروفیسر محی الدین حاجنیؔ کا ہے۔ جنہوں نے بیسویں صدی کے پانچویں عشرے کے بعد باقاعدہ طور پر غیر سرکاری صحافت میں قدم رکھا اور کتابِ صحافت میں اپنا نام ان مٹ سیاہی سے درج کرایا۔ پروفیسر حاجنیؔ نے بھی صحافتی سفر اصل میں ''گلریز'' سے ہی شروع کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ سری پرتاب کالج سرینگر کے سالانہ رسالے ''پرتاب'' کے مجلسِ ادارت کے ممبر ہونے کے ساتھ ہی اس کے کشمیری سیکشن کے مدیر رہے۔ علاوہ ازیں اس رسالے میں اُن کے مضامین تواتر کے ساتھ چھپتے رہتے تھے۔ لیکن حقیقت میں اُن کی صحافتی وسعت اور قابلیت کا نکھار ''گلریز'' میں ہی ہوا۔ ''گلریز'' یہاں کی ادبی صحافت کے لئے ایک بہت بڑے پلیٹ فارم کی صورت میں سامنے آیا اور اس نے اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان وادب کی بے انتہا خدمت انجام دی۔ گلریز کی انہی خدمات کے پیشِ نظر جب بھی ریاست میں اُردو رسائل کی بات کی جائے گی ''گلریز'' کا نام ہمیشہ عزت وتوقیر سے لیا جائے گا۔ صحافتی دنیا میں گلریز کو جو مقام ریاست میں بہت کم عرصہ میں نصیب ہوا اُس میں پروفیسر حاجنیؔ کا بہت بڑا رول ہے اور حقیقت یہ ہے کہ گلریز اور محی الدین حاجنیؔ لازم ملزوم ہیں۔

جہاں تک پروفیسر محی الدین حاجنیؔ کی صحافتی زندگی کا تعلق انہوں نے صحافت کے شعبہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈپلوما حاصل کیا تھا۔ اس تعلق سے کشمیر کی صحافت میں اُن کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔ حاجنیؔ صاحب کے بارے میں پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ وہ کشمیری، اُردو، انگریزی اور عربی زبانوں میں یکساں سہولیت کے ساتھ قلم اٹھا سکتے تھے۔ اُن کی صحافتی خدمات کے سلسلے میں یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ اکیس سال تک سری پرتاب کالج کے رسالے ''پرتاب'' کے کشمیری سیکشن کے مدیر رہے۔ اس لمبے عرصے میں کئی قلمکاروں نے

اس رسالے کے توسط سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا اور اُن میں سے کچھ قلمکاروں نے صفحہ اول کے قلمکاروں کی صف میں جگہ بنائی۔ پروفیسر حاجنیؔ کی ادارت میں رسالے کے کشمیری سیکشن نے بالخصوص اور پورے رسالے نے بالعموم معیار کی تمام ممکنہ بلندیوں کو چھولیا۔ چونکہ اس باب میں صرف پروفیسر حاجنیؔ کی اردو صحافت پر بات کی جائے گی، اس لئے ہم اُن اقدامات کے بارے میں بات نہیں کر سکتے، جن کی وجہ یہ رسالہ ''پرتاب'' آج بھی حاجنیؔ صاحب کی یاد دلاتا ہے۔

کتاب کے اس باب میں ہمارا سروکار پروفیسر حاجنیؔ کی اُردو صحافت کے ساتھ رہے گا۔ حاجنیؔ صاحب کی صحافتی زندگی کی ابتدا تو اُسی وقت ہوئی تھی جب انہوں نے علیگڑھ یونیورسٹی سے صحافت میں ڈپلوما کیا تھا۔ لکھنے کی ابتداء بھی انہوں نے وہاں سے ہی کی تھی۔ واپس آنے کے بعد اُن کے اردو مضامین یہاں کے معروف رسائل ''پرتاب''، ''گلریز''، ''شیرازہ''، ''ہمارا ادب'' اور مختلف اخبارات وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن جہاں تک کسی رسالے کیساتھ باضابطہ وابستہ ہونے کا تعلق ہے۔ اس میں ''گلریز'' کا نام ہی سب سے پہلے لیا جا سکتا ہے۔

''گلریز'' کشمیر بزم ادب کے ترجمان کے طور پر ۱۹۵۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس کے بانی مشہور ادیب، شاعر اور کشمیر کے سائنسداں مرزا غلام حسین بیگ عارفؔ تھے۔ یہ رسالہ دو زبانوں اُردو اور کشمیری میں چھپتا تھا اسلئے کشمیر میں ہی نہیں بلکہ کشمیر کے باہر بھی لوگ اس کے انتظار میں رہتے تھے۔ محمد صدیق کبرویؔ اس رسالہ کے مدیر و پبلیشر تھے۔ ابتداء سے لیکر مارچ ۱۹۵۳ء تک رسالہ کی نظر و ترتیب کی ذمہ داری محمد امین کاملؔ کے سپرد تھی۔ اس دوران پروفیسر حاجنیؔ کے متعدد مضامین اس رسالے میں شائع ہوتے رہے۔ مارچ ۱۹۵۳ء کے بعد سے اگست ۱۹۵۳ء تک نظر و ترتیب کا کام دو اشخاص کو سونپا گیا۔ ایک عبدالحق برقؔ اور دوم

محی الدین حاجنی۔ لیکن اگست ۱۹۵۳ء کے بعد رسالے کی نظر و ترتیب کی ذمہ داری مکمل ایک سال تک اکیلے پروفیسر حاجنی نے پوری کی۔ اس دوران یہ رسالہ ترقی کی منزلوں سے آگے بڑھتا ہوا، قومی اہمیت کے حامل رسائل کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ یہ پروفیسر حاجنی کی ان تھک محنت اور لگن کا نتیجہ تھا۔ حاجنی صاحب کی ان خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ''گلریز'' کے بانی مرزا عارف لکھتے ہیں۔

> ''گلریز کی نظر و ترتیب کا کام ''بزم ادب کشمیر'' نے پروفیسر محی الدین حاجنی کو مارچ ۱۹۵۳ء میں سپرد کیا تھا۔ پروفیسر حاجنی نے اپنی محنتِ شاقہ سے گلریز'' ایسے ادبی ماہنامے کی سابقہ روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ بڑی لگن اور سعی سے اسے آگے بڑھانے میں دریغ نہ کیا۔ اگرچہ ان کے ذوقِ ''نحو روپرداخت'' سے بعض ادیب اور شعراء کو شکایات بھی پیدا ہوئیں۔ لیکن مجموعی طور پر ادارہ پروفیسر صاحب کی کاوشوں کا ممنون و متشکر ہے اور انہیں منظرِ استحسان وستائش دیکھتا ہے۔''[۱]

گلریز رسالے کے ساتھ پروفیسر حاجنی صاحب کی مدیرانہ وابستگی تقریباً دو سال سے زائد عرصے تک رہی۔ حاجنی صاحب سے پہلے ''گلریز'' میں اداریہ لکھنے کی روایت نہیں تھی۔ حاجنی صاحب سے پہلے صرف ایک اداریہ لکھا گیا تھا۔ جو کامل صاحب نے لکھا تھا، اس کے بعد حاجنی صاحب نے اس رسالے کے مختلف شماروں میں، جن میں زیادہ سالنامے شامل ہیں، تقریباً تین اداریے لکھے۔ ان اداریوں سے حاجنی صاحب کے صحافتی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔

ہر تحریک اور ہر انجمن یا ادارے کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اپنے کاز کو حاصل کرنے کے

---

۱ گلریز ماہنامہ

لئے وہ مختلف پروگرام اور طریقے کار عملاتے ہیں۔ عموماً یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے مقصد کے بارے میں دوسروں کو بھی مطمئن کر کے اُنکی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہیں۔ ''گلریز'' کے ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۳ء کے سالنامے میں پروفیسر حاجنی صاحب کا پہلا اداریہ ''برسبیل تذکرہ'' کے عنوان سے چھپا۔ اس اداریہ سے اُس مقصد اور مدعا کی وضاحت ہوتی ہے۔ جو گلریز سے پورا ہونے کی توقع تھی۔ اس اداریے کے پہلے ہی اقتباس میں پروفیسر حاجنیؔ رقمطراز ہیں۔

> ''چنانچہ عمل اور جدید ردعمل کے ٹکراؤ سے ایک لائحہ عمل نمودار ہوتے ہی اس میں مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ پھر وہی عناصر پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی تلافی کیلئے ردعمل کی ابتداء ہوئی تھی۔ اور اس طرح ہر ملک کے ہر دور میں یہ سلسلہ عمل و ردعمل نئی امنگوں اور نئی امیدوں کی پیدائش کا باعث ہوتا ہے اور اسکی بدولت کارزار حیات میں ایک سرور انگیز کیفیت جاری رہتی ہے۔ جس کے آخری تجزیہ پر آج تک چند اقدار معین ہوئے ہیں۔ جو ہر تحریک کی مشترکہ میراث کی حیثیت سے تحریک کے قواعد و ضوابط، پروگرام اور منتہائے مقصد میں جھانکتے نظر آتے ہیں۔ ان اقدار کی جاذبیت فی الحقیقت ان کی حیات پروری، صلاحیت اور افادیت پر منحصر ہے۔ ان میں سے جو بقائے اصلاح کی کسوٹی پر پورا نہ اُترے اس کو اہل دانش قدر نہیں بلکہ زمانہ سازی کا ایک ہنگامی آلہ قرار دیتے ہیں۔ جو کند ہوتے ہی دور پھینکا گیا ہو''۔

پروفیسر حاجنیؔ ارباب اقتدار کے مشن اور کام سے کبھی مطمئن نہیں تھے اور ہمیشہ اُن کے خلاف شعلہ انگیز لہجہ اختیار کرتے تھے۔ وہ کشمیر اور کشمیریوں کی اقتصادی بدحالی، ذہنی پستی اور سماجی ویرانی کے بہت بڑے غم گسار تھے۔ اُن ک تصنیفات چاہیے اُردو میں ہو یا کشمیری میں

یا پھر انگریزی میں، ہر حال میں کشمیریوں کیلئے فکر مند نظر آتے ہیں ''برسبیل تذکرہ'' میں بھی اسکی مثالیں ملتی ہیں۔

''کشمیر کے ذہنی نشو ونما کے تاریخی شواہد کے تفحص میں اربابِ اقتدار کو اپنی موت نظر آتی تھی''۔

اس اداریہ کا گہرا مطالعہ کرنے سے حاجنی صاحب کے اندازِ فکر اور اندازِ بیان کا پتہ چلتا ہے۔ جدلیاتی مادیت، سائنسی اندازِ نظر اور اُنکی تاریخ فہمی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔

حاجنی صاحب کا ایک اور اداریہ ''شذرات'' کے عنوان سے نومبر ۱۹۵۳ء کے گلریز کے شمارے میں شائع ہوا۔ اداریے میں گلریز کے علاوہ ادب کے معیار کے بارے میں خوبصورت باتیں ملتی ہیں۔ اپنی ادبی روایت کو زندہ رکھنے کے ساتھ ساتھ، ماضی کے سرمایوں کی حفاظت کرنے کی تلقین کرنے سے آگے بڑھتے ہوئے حاجنی رقمطراز ہیں۔

''آج کل کے تجزیاتی دور میں ایک طرف تو گل و بلبل ٹائپ کی شاعری کو علی العموم جنسی بھوک سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسری طرف طویل افسانہ نویسی بے کاری کو بڑھانے کا ذریعہ ہے''۔

اس اداریے میں ایک طرف حاجنی صاحب ترقی پسندوں سے متاثر ہوتے ہوئے اُن کے سُر میں تال ملاتے نظر آتے ہیں۔

''اب وہ زمانہ نہ رہا کہ جب ادب محض دماغی تعیش اور صرف لسانی موشگافی کا کفیل خیال کیا جائے۔ بلکہ اب ادب زندگی کی عکاسی کا بہترین اور زبردست اثر آفریں آلہ مانا جاتا ہے''۔

لیکن حاجنی ادب کو پروپیگنڈا اور نعرہ بازی کے لئے استعمال کرنے کے قائل نظر نہیں آتے ہیں۔

اگر یہ جانتے ہوئے بھی ہم چونک نہ اٹھے تو یاران تیز گام وقتی ''تقاضوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ادب کو پروپیگنڈا کی پستی تک گرا کر ہی دم لیں گے ''

اس مضمون میں ادب کے متعلق حاجنی صاحب کے نظریات واضع ہوجاتے ہیں۔

اُردو زبان مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی وارد ہند ہوئی۔ وارد ہونے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ زبان باہر سے آئی۔ بلکہ فارسی بولنے والے ہندی کو نہ سمجھ سکیں اور ہندی والے فارسی کو، اسلئے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ یہی رابطہ کی زبان اُردو ہے۔ ارباب اقتدار نے ہمیشہ اُردو کے ساتھ گھر جمائی کا سا برتاؤ کیا۔ اگرچہ مسلمانوں کے دور میں اس زبان نے سرکاری سرپرستی میں پر پھیلائے اور اُتر سے اڑکر دکن بھی پہنچ گئی۔ لیکن مسلمانوں کے بعد اس زبان کے ساتھ جو ناروا سلوک برتا گیا۔ اُسمیں شاید ہی دوسری زبان زندہ رہتی۔ انگریزوں نے اگرچہ اس کی اہمیت کو بھانپتے ہوئے اس کو مشینی دور میں داخل کر دیا۔ لیکن اپنی تمدنی اور ثقافتی یلغار سے ہر وقت اس زبان کو پچھاڑنے کی کوشش کی۔ آزادی کے بعد بٹوارہ ہوا، بٹوارے نے آر پار لوگوں کے دلوں کو زہر آلود بنا دیا۔ اُردو اس طوفان سے کیونکر بچتی۔ اُردو کے خلاف کیا کیا نہ کیا گیا۔ لیکن اس زبان نے ہر حال میں جینے کی قسم کھائی ہے۔''

پروفیسر محی الدین حاجنی کا ایک اور شاندار اداریہ ''گلریز'' کے فروری ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس اداریہ کا عنوان ''معروضات'' ہے۔ اداریہ کا پہلا حصہ اُردو کے متعلق ہیں۔ جو مسلسل ناہمواریوں اور نامساعد حالات کے باوجود زندہ رہی۔ حاجنی صاحب اُردو کے متعلق یہ کہتے ہیں۔

''اُردو کی قسمت میں گویا یہ ایک ازلی فیصلہ ہے کہ جب بھی اس کی مخالفت شدید اور وسائل محدود یا قریب قریب معدوم ہوجائیں۔ اس کی مقبولیت عامہ وسیع سے وسیع تر ہوتی جائیے''

اُردو زبان کے متعلق انگریزوں کی نیت پر شک کرنا جائز ہے۔ کیونکہ ''امتیازی زبان'' نام رکھ کر وہ اس کی اہمیت کو کم کرنے کیلئے کوشاں تھے۔ طرّہ یہ کہ آزادی کے بعد اپنے جنم داتاؤں کو بھی یہ زبان یاد نہ رہی۔ لیکن عوام کی زبان تھی اور عوام کے پاس ہی ہر دشواری کو سینے سے لگا کر زندہ رہی۔ انگریزوں کی نیت کو کھنگالتے ہوئے، ہندوستان کے اربابِ اقتدار سے حاجنی صاحب اس مضمون میں جواب طلب کرتے ہیں۔

> ''انگریز بہادر براجمان ہوا تو اسکی ''کم مائیگی کو مشتہر کرنے کی نیت سے قریباً ڈیڑھ سو سال تک امتیازی زبان نام رکھ کر سرکاری حمایت سے محروم رکھا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب انگریز اقتدار ختم ہوا اور لیلائے آزادی کے عشق نے عوام کی اکثریت کو مجنوں بنا ڈالا۔ تو سیاست کے اربابِ بست وکشاد کو دہلی میں رہ کر بھی دہلی کی زبان یاد نہ رہی اور اب یو۔ پی۔ اور دلی والوں کو آئینی ذرائع سے ثابت کرنا ہے کہ وہ اُردو بول رہے ہیں لاطینی یا چینی نہیں۔ کیا ان حوادث کے دباؤ سے اُردو زبان زوال کی طرف مائل رہی یا ترقی کی طرف؟ تاریخ شاہد ہے کہ اُردو نے ان ہی ناخوش آئیند تین دوروں میں وہ تمام لسانی، ادبی وعلمی منازل طے کئے جو دوسرے ممالک کی زبانوں نے کئی صدیوں کے مسلسل، منظّم اور حاکمانہ تربیت کے بعد طے کئے ہوں''

بیسویں صدی کے پانچویں اور چھٹے عشرے میں جب ترقی پسند تحریک کا زور ختم ہو چکا تھا اور جدیدیت کے رجحان کے تحت ''ادب برائے ادب'' کا پروپیگنڈا شروع ہوا۔ تو ادیب

زبان کی طرف زیادہ مائل ہوگئے اور معنی لسان اور بیان کی قدروں پر قربان ہونے لگا۔

''معروضات'' کا دوسرا حصہ اُن ہی ادیبوں کیلئے ہیں۔ جنہوں نے زبان و بیان کے حسن کی بحالی کیلئے معنی اور مطلب کی بھلی چڑھا دی۔ ملاحظہ ہو حاجنیؔ صاحب کا یہ جملہ۔

> ''جن مضمونوں میں باتیں زیادہ اور مطلب چشم بددور قریب مفقود ہوں تو خواہ اس قسم کے مضامین میں زبان کے اعتبار سے بہت ہی کم نقائص کیوں نہ ہوں ہم اُن کو زیورِ طبع سے آراستہ نہیں کر سکتے''

اسی اداریہ میں آگے چل کر حاجنیؔ صاحب نثر نگاروں کو ایک اُستاد کی طرح سمجھاتے ہیں اور انہیں ہدایت کرتے ہیں کہ۔

> ''عنوان کی پوری پابندی کا خیال رکھ کر صحیح اُردو میں کسی ادبی، تاریخی، معاشرتی المختصر بے ہودہ سیاست کے سوا کسی مسئلہ پر جو چاہیں، پوری ذمہ داری اور اختصار سے لکھیں''

تاریخ گواہ ہے کہ اکثر ادبی تحریکیں اس لئے زوال پذیر ہوئیں کیونکہ آخری ایام میں یہ انتہا پسندی کی شکار ہو جاتی ہیں۔ مذہبی شعراء تبلیغ پر اُتر آتے ہیں، متصوفیانہ شاعری میں توہم پرستی رچائی جاتی ہیں۔ سماجی شاعری صحافت بن جاتی ہے۔ غرض ایسی انتہا پسندی سے ادبی اقدار مجروح تو ہوتے ہی ہیں، ساتھ ہی ساتھ اگر کسی رسالے یا اخبار میں ایسی شاعری کو زیورِ اشاعت سے آراستہ کیا جائے تو اُس رسالے کے معیار کا گرنا یقینی ہو جاتا ہے۔ پروفیسر حاجنیؔ کے دور میں ''گلریز'' ایسی ستم ظریفی سے بچ نکلا۔ جدید شاعری کو اپنی ظریفانہ طنز کا نشانہ بناتے ہوئے پروفیسر حاجنی شاعروں کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں۔

''جہاں ہم نے مذہبی منظومات میں قل اعوذیت کی تبلیغ یا اعتذار پسندی، متصوفیانہ نظموں میں خالص پیر پرستی یا عقائد نمائی، جمالیاتی غزلوں میں ''لول ہے سندری لول ہے آم'' قسم کی بے ہودہ آہ وزاری اور سماجی اشعار میں پروپیگنڈا، سب وشتم اور فساد کو نمایاں پایا، ادبی قطعات میں غیر مربوط خیالات کی کھچڑی اور غیر مانوس الفاظ کا پلندہ دیکھا۔ تو ہم نے ان بھانت بھانت بولیوں کے ذریعے رسالہ کے معیار کو گرنے سے بچایا۔ اس سلسلے میں ابھی ہم اپنی معذوریت کا جواز ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ ہمارے پاس آزاد شاعری کا بھی ایک بھاری بھرکم بوقچہ جمع ہوگیا۔ جن میں عروضی قواعد کو بیک اشارہ ترقی پسندی بقول کسے ''کوئٹ انڈیا'' کہا گیا ہے۔ ان متشاعرین سے ہماری گذارش ہے کہ جب بیلنک ورس لکھنے والے شیکسپیئر کسی زبان میں پیدا ہوئے ہیں۔ تو وہ اپنی شخصیت، انفرادیت اور انانیت منوا کر عالمِ بقاء کو سدھارتے ہیں۔ فی الحال آپ اس یاددہانی کو ہماری قدامت پروری سے تعبیر کیجئے یا خلیل ابن احمد کی روح کی اثر آفرینی کہ ہم اکاسٹھ، باسٹھ، تریسٹھ، چونسٹھ، پینسٹھ، چھیسٹھ قسم کی ''موزون'' شاعری کو بھی چھاپنے سے قاصر ہیں۔ چہ جائیکہ وہ ''ابیات'' جہاں ردیف، قافیہ اور بحر کو محض اسلئے ترک کر دیا

گیا ہو کہ نوخیز'' آزاد شاعر'' نے ان کی رعایت کو بھی فرسودہ نظام کی یاد

گار سمجھ لیا ہے''

''گلریز'' کے مالی وسائل بہت محدود تھے۔ چند بزرگوں کی مالی معاونت کے علاوہ یہ رسالہ بھکری سے حاصل آمدنی پر ہی چلتا رہا۔ ''معروضات'' کا آخری حصہ اگرچہ معاونین کیلیئے ہیں۔ لیکن اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اسمیں ''گلریز'' اور اس دور کے دیگر رسائل کا ایک موازنہ نظر آیئے گا۔

''آپ کو چند باتوں کا علم تو ہے لیکن بشریت کی سبب آپ ان کو کبھی کبھار بھول بھی ڈالتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ''گل ریز'' کو کسی حکومت کا دستِ شفقت تھپکی نہیں دیتا۔ ''گل ریز'' کسی جاہ پسند ادارے کا آرگن نہیں کہ مالی امداد کی توقع پر اُن اشخاص کو اچھالے۔ جن کی شخصیت تاریخی زاویہ نگاہ سے مستحقِ توصیف نہیں۔ ''گلریز'' اشتہار بازوں کے ذریعہ آمدن کو محض اس لئے قبول نہیں کرتا۔ کہ ادبیات عالیہ کے ساتھ ساتھ فحش، فریب انگیز اور زرگرانہ اشتہاروں کی طباعت واشاعت قریب قریب ادب کی توہین ہے۔ (یہ امتیاز تمام رسائل میں سے ''گلریز'' کے حصے ہی آیا ہے!) ''گلریز'' گندھی سیاست کے گندھے کھیل کا کھلاڑی نہیں کہ اپنے کرتب کو ہی ذریعہ زندگی سمجھے''۔

پروفیسر حاجنی کا یہ ادارتی مضمون اپنی علمی رنگارنگی، طنزیہ انداز اور تنوع کی بناء پر اہمیت اور انفرادیت کا حامل ہے۔ اس اداریہ میں اُردو کی تاریخ بھی دیکھنے کو ملتی ہے اور وہ حالات پیشِ نظر ہو جاتے ہیں جن میں اُردو نے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اس اداریے میں حاجنی صاحب ایک طرف قلم کاروں کو لکھنے کے آداب واصول اور ''گلریز'' کے تقاضے سمجھاتا ہے

اور دوسری طرف اُن کی تخلیقات کو زیورِ طبع سے آراستہ نہ کرنے کا جواز بھی سامنے رکھتا ہے۔ اس مضمون کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں کہیں بھی حاجنؔی صاحب نے تخلیقات کو نہ چھاپنے کی بنیاد پر معذورانہ انداز نہیں اپنایا ہے۔ الٹا لکھنے والوں کو ہی کوستے ہیں کہ اُن میں وہ ہنر اور صلاحیت ہی نہیں جس سے اُن کی تخلیقات ''گلریز'' کے معیار پر پوری اُتریں۔ آخر پر جب حاجنؔی صاحب معاونت کرنے والوں کی طرف رخ کرتے ہیں تو باتوں باتوں میں ''گلریز'' کا دوسرے رسائل کے ساتھ موازنہ پیش کردیتے ہیں۔

جہاں تک اس مضمون کی زبان کا تعلق ہے۔ اس کی زبان علمی ہونے کے باوجود عام فہم ہے۔ اس اداریہ کا اسلوب حاجنؔی صاحب کا اپنا اسلوب ہے۔ اس ادارے کے اسلوب کو لوگ ''حاجنیت'' کے نام سے جانتے ہیں۔ حاجنؔی کا یہ اسلوب آگے اُن کے خطوط میں بھی جابجا نظر آتا ہے۔

اُردو صحافت سے قطع نظر حاجنؔی صاحب کئی کشمیری رسائل کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ اُن میں ''سری پرتاب'' کالج کے ''پرتاب'' کا پہلے ہی ذکر کیا جاچکا ہے۔ شمالی کشمیر کی تہذیبی، ثقافتی وادبی تنظیم ''ادبی مرکز کمراز'' کی طرف سے جو رسالہ ''مشاہیر کمراز'' کے نام سے شائع ہورہا تھا۔ اُس کی نظر وتربیت حاجنؔی صاحب ایک مدت تک انجام دیتے رہے۔ بعد میں رسالے کا نام تبدیل ہوکر ''پروہ'' پڑا۔ ''پروہ'' ۱۹۸۹ء تک حاجنی صاحب کی نگرانی میں شائع ہوتا رہا۔ یہ رسالہ آج بھی باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ حلقہ ادب حاجن سوناواری کا رسالہ ''وولر کی ملر'' بھی ایک مدت تک پروفیسر حاجنؔی صاحب کی نگرانی میں لگاتار چھپتا رہا۔ یہ رسالہ بھی ابھی تک تسلسل کے ساتھ چھپ رہا ہے۔ یہ دونوں رسائل آج کل نئے اور ابھرتے قلمکاروں کے لئے بہت بڑے پلیٹ فارم ہیں۔

پروفیسر محی الدین حاجنی

ایک مکتوب نگار

دور حاضر ایک سائنسی دور ہے۔ کمپیوٹر کی کرامات نے پوری دُنیا کو ایک عالمی گاؤں (Global Village) بنادیا ہے۔ سائنس کی تازہ دین نے انسانی زندگی میں قیامت خیز تغیرات پیدا کئے۔ اب بات قاصد نہیں، ٹیلی فون نہیں بلکہ انٹرنیٹ کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ لیکن اس گماسان کے مشینی دور میں بھی خط کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ہاں! اس کی اہمیت تھوڑی بہت مجروح ہو بھی گئی ہو۔ لیکن آج بھی دیوانے ''مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط تو ہم سے لکھوائے'' کی تسبیح خوانی کرتے نظر آتے ہیں۔ ہاں ''کمپیوٹر کے آنے پر بھی ایک عالم رہا'' یہی خط کی اہمیت ہے۔

خطوط نگاری کا فن وہ تحریری آئینہ ہے۔ جس سے ہمیں مکتوب نگار کے طرز تحریر، زبان و بیان، اسلوب، میلانِ طبع، زبان پر اُس کے عُبور، ابہام وایہام اور فصاحت و بلاغت کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی اُس کی تخلیقات میں موجود استعاراتی، تشبیہاتی اور تلمیحاتی برتاؤ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر مکتوب نگار کی زندگی کے مختلف پہلو ہمارے پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ مکتوبات بھی ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ہم کسی قلمکار کی شخصیت اور ادبی

معیار کو پرکھ سکتے ہیں۔ خط اپنے دور کے سماجی، سیاسی اور معاشی رجحانات کا پتہ دیتا ہے۔

اُردو زبان و ادب میں بھی مکتوب نگاری کا رواج ابتداء سے ہی رہا ہے۔ اُردو کے عظیم شعراء مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اور ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ بہت اچھے مکتوب نگار بھی تھے۔ اُن کی عظمت کا راز اگر چہ اُن کی شاعری میں مضمر ہے۔ لیکن اُن کے خطوط بھی کسی کم پائیہ کے نہیں ہیں۔ غالبؔ کو اپنے خطوط کی بناء پر ہی ''حیوانِ ظریف'' کہا گیا ہے۔

جہاں تک پروفیسر محی الدین حاجنیؔ کا تعلق ہے۔ وہ بھی ایک بہت اچھے اور کشمیر کے بہت بڑے مکتوب نگار ہیں۔ انہوں نے بہت ہی خوبصورت اور علمی و ادبی لحاظ سے اہم خط اپنے دوستوں کو لکھے۔ ان خطوط سے اُن کی زندگی کی مختلف جہتیں ہماری نظروں کے سامنے آتی ہیں۔ اور کئی اداروں اور شخصیات کا ظاہر و باطن بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اگر حاجنیؔ صاحب کے خطوط کو کوئی مالک رام یا گوپی چند نارنگ ملا ہوتا، تو وہ بھی اس میدان میں غالبؔ کے ساتھ آنکھ ملا سکتے تھے۔ لیکن ناداریٔ قسمت یہ کہ حاجنیؔ کے خطوط طاق نسیاں ہو چکے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ اگر اس کتاب میں حاجنیؔ صاحب کی مکتوب نگاری کا تذکرہ نہ کیا جائے تو اُنکے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ حاجنیؔ صاحب نے اُردو میں بہت سارے خطوط اپنے دوستوں اور احباب وغیرہ کے نام ارسال کئے ہیں۔ لیکن ان خطوط کو حاصل کرنا دل گردے کا کام ہے۔ جو میرے بس سے کوسوں دور ہے۔ اس لئے میں نے مختلف کتابوں میں موجود اُن کے لکھے ہوئے خطوط کو جمع کر کے یہاں نمونے کے طور پر پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ امید ہے کہ راقم کی بے بسی اور کم ہمتی کو عذرِ متعلق سمجھا جائے گا۔

پروفیسر حاجنیؔ کے خطوط کی زبان بھی وہی ہے۔ جس کا انہوں نے اپنی مختلف تحریروں میں استعمال کیا ہے۔ ہاں! اُن کے خطوط میں ایک لسانی سنگم دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے

اُردو خطوط میں کئی کئی کشمیری الفاظ و تراکیب کو ٹھونسا ہے۔ وہی زبان، وہی انداز بیان اور اسلوب جس کے بارے میں مدیر آئینہ مرحوم شمیم احمد شمیمؔ لکھتے ہیں۔

''حاجنیؔ صاحب سے کچھ سمے بات کرنے کے بعد وہ فقرہ یاد آتا ہے جو کسی تذکرہ نویس نے میر تقی میرؔ پر چُست کیا تھا'' بلندش نہایت و بلند پستی غایت پست۔'' ایک ہی سانس میں ادب اور فن کے بصیرت افروز رموز، سائنس اور فلسفہ کے دقیق نکات، سیاست وفقہؔ کے بلیغ رمز اپنے کھر درے دہقانی لہجے میں سلجھاتے جائیں گے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ''ہیڈ لانگ'' کر کے دُنیا بھر کی مغلظات اور انتہائی چھوٹی باتیں دہرانا شروع کر دیں گے۔ اور آپ ''یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے'' کہتے ہوئے اُن کا منہ تکتے رہیں گے۔ لیکن حاجنی صاحب کی ان گالیوں سے اُن کے جاننے پہچاننے والے خائف نہیں ہوتے۔ اس ''فن کثیف'' میں اُن کا ہمسر اگر کوئی کشمیر میں ہے۔ تو وہ میر راجپوری [1] ہیں۔ دونوں حضرات گالیاں ایجاد کرنے میں ساہتہ اکیڈمی ایوارڈ کے مستحق ہیں۔ دونوں حضرات گالیاں دیتے ہوئے شرم اور نفاست نام کی کسی چیز سے پریشان نہیں۔ بلکہ گالی ایسے دیتے ہیں۔ جیسے دعائیں دے رہے ہوں۔ مگر مماثلت یہیں پر ختم ہوتی ہے۔ راجپوری کی گالیاں اُس کی بیمار

---

[1] میر غلام محمد راجپوری ایک وقت کی عوامی سرکار کا منسٹر

رُوح کی ڈراونی چیخیں اور اُس کے جذبہ انتقام کی نوک دار سلاخیں ہیں۔ حاجنیؔ کی گالیاں بے ریا دل کی بے ہنگم موجیں اور اُس کی پیار اور خلوص کا بھونڈا اظہار ہے۔ اور اسی لئے جہاں راجپوری کی گالی سے طبیعت مکدّر ہو جاتی ہے وہاں حاجنیؔ صاحب کی گالی کے بعد غالبؔ کا یہ شعر یاد آتا ہے

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بھی بے مزا نہ ہوا[1]۔"

پروفیسر حاجنیؔ صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسی قسم کے اندازِ بیان کو اپنے مکتوبات میں استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے خطوط میں ایک لمحے دُنیا جہاں کے مسائل کو سلجھاتے نظر آتے ہیں لیکن اگلے اقتباس میں "بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ" کے مصداق قاری کو حیران و پریشان کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔

شمالی کشمیر کی تمدنی، ثقافتی اور ادبی تنظیم "ادبی مرکز کمراز" کے کارکنوں اور ممبران کے ساتھ حاجنیؔ صاحب کا تعلق بہت گہرا تھا۔ اکثر حاجنیؔ صاحب اس تنظیم کے ممبران کو مختلف موقعوں پر خط لکھتے رہتے تھے۔ حالانکہ اُنہوں نے انگریزی، اُردو اور کشمیری میں بہت سارے خطوط لکھے ہیں۔ اگر حاجنیؔ صاحب کے خطوط کو جمع کر کے کتابی صورت دے دی جائے۔ تو کئی حصوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب تیار ہوگی۔ پھر اگر اُس کتاب کی ادبی اہمیت اور قدر کا تعین کیا جائے تو حاجنیؔ صاحب کے خطوط کی افادیت مارکسؔ، غالبؔ، اقبالؔ یا ابو

---

[1] ہفتہ روزہ "آئینہ" شخصیات نمبر سالنامہ ۱۹۶۹ء

الکلام آزاد کے خطوط سے کم نہیں ہوگی۔ حاجنؔ صاحب نے اپنے خطوط میں طنز آمیز لہجہ اختیار کرنے کے علاوہ، زمانے کے حالات کی عالمانہ عکاسی کی ہے۔ محمد احسن احسنؔ کے بقول، حاجنؔ کا اُردو میں لکھا ہوا تنہا انصاریؔ مرحوم کے نام ایک خط، اتنا خوبصورت، پر معنی اور ضخیم ہے، کہ صرف اُسی ایک خط سے ایک کتاب تیار کی جاسکتی ہے" یہاں پر ایسے خطوط کو شامل کرنا ناممکن ہے۔ پھر بھی حاجنؔ کے طرزِ نگارش اور اسلوبِ "حاجنیت" کو جاننے کیلئے کچھ خطوط کو پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ اُن کی مکتوب نگاری کی مختلف جہتیں اور فنی خوبیاں واضح ہو جائیں۔

۱۹۶۸ء کا سال اور معراج النبیؐ کا مقدس دن تھا کہ ریڈیو کشمیر سرینگر کے ڈریکٹر شری نندلال چاولہ نے مرحوم تنہا انصاری کے نام ایک ڈی۔او۔(D.O) بھیج دیا کہ وہ اس موقع پر ایک منظوم فیچر فوری طور پر تحریر کر کے ریڈیو کشمیر کو ارسال کریں۔ تنہاؔ مرحوم نے دعوت قبول فرمائی۔ منظوم فیچر پروڈیوسر ریڈیو کشمیر فاروق نازکیؔ کو بھیجنے کے بعد انہوں نے حاجنؔ صاحب کو خط لکھ کر انہیں فیچر سننے کیلئے کہا۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اس فیچر کے متعلق اپنے تاثرات تحریر کر کے بذریعہ ڈاک بھیجے جائیں۔ حاجنؔ صاحب نے فیچر کو سن کر اپنے تاثرات قلمبند کر کے تنہا انصاریؔ کو روانہ کئے۔ ملاحظہ ہو۔

"حاجن

۲۲/اکتوبر ۱۹۶۸ء

اختی المکرّم السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

امابعد! خط ملا۔فرمائش سُنی۔اندر کے لے پالکوں نے صرف ایک مقام پر (بَلَغَ العُلیٰ بِکَمالہ) کے بعد موسیقی کا حق ادا کیا تھا اور باقی پیشکش میں فضول موسیقی کے ذریعے آپکے اکثر الفاظ گول مول کرادیئے۔اس ''چوبر پرور ''سٹیشن نے زنانہ آمیزش سے فیچر کے روحانی تاثر کو ''ہلکا پھلکا'' بنانے کی بھی حماقت کی تھی۔تحریری پیش کش اور ریڈ یائی پیش کش میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ جہاں آپ نے تدریجی اندازِ بیان سے نفسِ مضمون کو دِلفریب، رقت آمیز اور ایمان افروز بنادیا تھا۔وہاں ساتھی ہی تبت بقال،ایسا پیشہ ور گویا بھی فیچر کا نعتیہ سرور اور فنکارانہ زیر و بم (Cadence) قائم نہ رکھ سکا۔

آپکی نثر خواص پسند ''نثر تھی۔لیکن (جیسا کہ آپ نے خود لکھا ہے) اس مضمون کا تقاضا ہی یہی تھا۔لیکن حضرت عیسٰیؑ کے متعلق آپ کا یہ دعویٰ کہ ان کا رفع الی السمآء نص قرآنی سے ثابت ہے۔میرے نزدیک غلط عقیدے کا شاخسانہ ہے۔کیونکہ اس طرح آپ ''رفع اللّٰہ الیہ ''آیت میں ''اللّٰہ'' کو ''السمآء ''کے ہم معنی قرار دیتے ہیں۔جو درست نہیں۔

اختلاف تو آپ کے اسی عقیدے سے رہا۔باقی آپ کی کوشش ادب، اسلام اور عشق محمدی ﷺ سے یقیناً مملو تھی اور میرا اندازہ ہے کہ ہر سننے

والے کا مجموعی تاثر بھی یہی ہوگا۔ آپ کی تضمین دل پسند تھی اور طرز نگارش عالمانہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کم سے کم وقت کے اندر معراج النبی ﷺ، ایسے بلند پایہ موضوع پر اس سے خوب تر اور مرطوب المعانی چیز شاذ ہی متوقع ہے اور سرینگر ریڈیو چونکہ کُفر، نِفاق، بہتان، کذب اور فِسق کی بدبو سے گھرا ہوا ہے۔ اس لئے اگر اس کی نشریات میں کوئی اسلامی موضوع ٹھونسا بھی جائیے تو یہ محض کرامت ہے۔ کہ وہ سراسر مسخ نہیں ہوتا۔ لہٰذا آپ کا فیچر اگر مجروح بھی ہوا، تو اس سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے۔ تمنّہ دُعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپکو صحتِ کامل عطا کرے۔ آمین

فقط تحریر الصدر

نیاز مند

محی الدین حاجنی ''

اس خط کو پڑھ کر حاجنؔی صاحب کی علمی بصیرت کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے۔ ساتھ ہی ریاست کے مختلف سرکاری اداروں کے تیئں اُن کا وطیرہ بھی سامنے آتا ہے۔ ریڈیو کشمیر سرینگر خدا کے فضل سے اُن دنوں پھر بھی، نام تو لیا جاسکتا تھا۔ لیکن آج یقینی طور پر وہ ''جو بر پرور'' ہو چکا ہے۔ عورتوں کی اتنی تعداد کہ تلاوت بھی اب اُن ہی سے کرائی جاتی ہے۔ کوئی مذہبی پروگرام اگر شب قدر، عید میلاد النبیؐ یا معراج النبیؐ پر نشر کرنا ہو۔ تو زنانہ آمیزش کیا، زنانہ ہی زنانہ ہوتا ہے۔ دوردرشن کا حال خدا بہتر کریں۔ بیان کرنے کے لائق ہی نہیں۔ اس اسٹیشن

کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔اس کے اکثر پروگراموں میں عورت کے بغیر کام ہی نہیں چلتا ہے۔آج کے الیکٹرانک میڈیا نے تو عورت کو برہنہ کردیا اور اس کو ایک بازاری شے بنادیا ہے۔عورت کا جسم آج کے دور میں برقی ذرائع ترسیل کی بھکری کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ان سبھی حقائق کو حاجنیؔ نے صاحب آج سے بہت پہلے اپنے خط میں ظاہر کیا۔

پروفیسر محی الدین حاجنیؔ اور دلنہ بارہمولہ کے انصاری خاندان کے مراسم کافی اچھے تھے۔اس گھرانے کے ساتھ حاجنیؔ صاحب کا تعلق بہت گہرا تھا۔کہتے ہیں کہ حاجنیؔ صاحب مرحوم نے سب سے زیادہ خط اسی خاندان کے افراد کے نام لکھے ہیں۔متذکرہ بالا خط بھی اسی خاندان کے ایک بزرگ کے نام تھا۔اب پیش ہیں مرحوم نشاط انصاریؔ کے نام لکھے گئے

ایک خط کے چند اقتباسات۔اس خط کے ذریعے پروفیسر حاجنیؔ صاحب کے اسلوب کے چند اور پہلو نمایاں ہونگے۔

''حاجن

۱۴ رجنوری ۱۹۷۰ء

اخی العزیز

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گمان اب یقین تک پہنچ چکا ہوگا کہ راقم الحروف نہ آنکھوں سے کام لیتا ہے اور نہ کانوں سے اور اس عندیہ کی تصدیق آپ یوں کرتے ہونگے کہ آنکھیں ہوتیں تو میرے خط کو دیکھا ہوتا۔کان ہوتے (خود سہی) دوسروں سے میرے خطوں کی عبارت سنی ہوتی۔آپ کے اس مفروضہ کی تردید میں یہ چند سطور لکھ رہا ہوں اور عرض پرداز ہوں کہ آپ

کے خطوں میں سے قریباً سب جواب کے اس قدر طلبگار نہ تھے، جسقدر عمل کے اور میرا اعمالنامہ سینکڑوں ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ جہاں میرا کام (خواہ دینوی ہو یا اخروی) ادھورا ہی رہا ہے۔

آپ کے ابتدائی خط کا مضمون یہ تھا کہ میں آپ کے تبادلے کے سلسلے میں اپنا پارٹ ادا کر نہ سکا۔ بدقسمتی یہ تھی کہ دو دنمار رُسل ڈار[1] کو آپ کے ساتھ سینہ بسینہ عداوت ہے اور میرے ساتھ اعلانیہ۔ پھر بھی میں نے جب آپ کی مرسولہ ملامت کو آزاد صاحب[2] کے نیم گنجا سر پر سود مرکب کے ساتھ تھوپ دیا تو اُس وقت آپ ''کریری'' پہنچائے گئے تھے اور میرا غیض و غضب بقول کسے ''اپے تھس'' (Apathes) ہو کر رہ گیا''

اس خط میں پروفیسر حاجنؔی نے کشمیر کے کچھ اہم اور تاریخی مقامات کا ذکر بھی سرسری طور پر کیا ہے۔ علاوہ ازیں چند اہم عہدوں پر فائز شخصیات کی کشمیر دشمنی کا ذکر بھی غیر محسوس طریقے سے کیا ہے۔

''ڈوگرہ سیکریٹری کو میں خود تفصیلات سنا کر زیادہ سے زیادہ عطیہ کی ادائیگی پر مائل نہ کرسکوں گا۔ آپ نے اس بارے میں میرے ساتھ اتفاق بھی کیا

---

[1] غلام رسول ڈار ۔ اُس وقت کے ڈپٹی ڈیکریکٹر محکمہ تعلیم

[2] غلام رسول آزاد ۔ سابقہ ناظمِ تعلیمات جموں و کشمیر

تھا، لیکن بٹہ مالواڑے کی گوناگوں خصوصیت میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے
کہ وہاں کی بات بس کی رفتار سے کافور ہوتی ہے۔"

تنہا انصاریؔ کی وفات کے بعد پروفیسر حاجنیؔ دل برداشتہ ہونے کے علاوہ بہت حد تک عدیم الفرصت بھی ہو گئے تھے۔ اس لئے دلنہ کے انصاری خاندان کے یہاں آنا جانا تھوڑا کم ہو گیا۔ اسلئے اس خط میں آگے حاجنی کا انداز معذورانہ ہے۔ لیکن انداز تو دیکھئے۔

"مجھے توقع ہے کہ آپ اور جنت نشان تنہا کے بچے مرحوم و مغفور کے شکیب آزما غم میں ہمیشہ برابر کا شریک تصور کریں گے۔ خدا نے اگر مجھے گوناگوں مصروفیتوں اور خوامخواہ کی پریشانیوں میں گرفتار نہ کیا ہوتا تو آپکی دلجوئی نہ سہی کم از کم اپنا ذہنی اضطراب ہی ہلکا کرنے کے لئے گذشتہ سال ایک یا دو دفعہ اپنے محبوب بھائی کی قبر پر آنسو بہانے ہی کے غرض سے آیا ہوتا۔ یہ تغافل یقیناً ایک ایسا سہو ہے۔ جو کسی عذر پذیری سے ہی رفع نہیں ہو سکے گا۔

فقط تحریر الصدر

نیاز مند
حاجنیؔ"

اس خط کی زبان اور اس کا اسلوب مرزا غالب کی یاد تازہ کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، کَسی ہوئی باتیں، معذرت میں بھی معیار، حاکمانہ لہجہ یہی ہے محی الدین حاجنیؔ کا حاجنیؔ

اسلوب۔ کاش ان خطوط کو جمع کر کے ایک کتابی صورت میں شائع کیا جاتا، تو پروفیسر حاجنیؔ کا معیار نئے سرے سے متعین کرنا پڑتا۔

پروفیسر حاجنیؔ کے بارے میں کچھ لوگوں نے عدواتاً یا محبتاً ایک رائے قایم کر لی تھی، وہ یہ کہ پروفیسر حاجنیؔ اپنے افراد خانہ کے معاملے میں غفلت برتتے تھے۔ اکثر کہا گیا ہے کہ اپنے فرزندِ واحد کی اُنہیں بہت کم فکر رہتی اور وہ اُس کے مستقبل اور دیگر معاملات میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ اب یہاں میں پروفیسر حاجنیؔ کے محمد احسن احسنؔ کے نام لکھے ہوئے ایک خط کو پیش کرتا ہوں۔ یہ خط پروفیسر حاجنیؔ نے جموں جیل سے احسنؔ صاحب کے نام لکھا تھا۔ اس خط سے اُس مفروضہ کی تردید ہوتی ہے کہ حاجنیؔ صاحب اپنے افرادِ خانہ کے تئیں غیر ذمہ دار تھے۔

''جموں''

عزیزی محمد احسنؔ

اسلام علیکم۔ امابعد

آپ کے خط کو پڑھ کر مجھے افسوس نہ ہوا۔ کہ سال روانہ میں یونیورسٹی نے آپکو امتحانِ کامل میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ کیونکہ میں نے کوئی تین ماہ پہلے یہاں سے رجسٹرار صاحب کو ایک خط لکھا تھا۔ کہ انہوں نے کیسے ۱۹۶۷ء کے بجائے ۱۹۶۶ء ہی میں کامل امتحان کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اسی خط میں میں نے اس سے پوچھا تھا۔ کہ درخواست پیش کرنے کے بعد بھی آپکے اور حلیمہ کے اختیاری پرچہ کا نتیجہ کیوں تا حال شائع نہ کیا گیا۔ اب جو آپ کے خط سے معلوم ہوا۔ کہ میری ارسال

کردہ فہرست نصاب بھی یونیورسٹی کے دفتر میں نظر نہیں آئی۔ تو میں حیران ہوا۔ حالانکہ چستی صاحب[1] نے مجھے اس فہرست کے جواب میں اطلاع کر لی ہے۔ کہ میری پیش کردہ فہرست رسمی منظوری میں پیش ہوگی۔ حیرانی کا مقام ہے۔ کہ متعلقہ سیکشن میں یہ فہرست ہی ناپید ہے! مزید برآں میں نے آج تک دو دفعہ آپکو اپنی تجویز کردہ فہرستِ کتب کی نقل بھیج دی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اغلب ہے کہ ان میں ذرا سا ہیر پھیر کیا جائے۔ لیکن آپ کے حالیہ خط سے محسوس ہوتا ہے۔ کہ آپ کے پاس دو دفعہ ارسال کردہ فہرست پہنچی ہی نہیں۔ کیا آپ اس گرہ کو کھول سکیں گے؟ یعنی یہ کہ کیا آپ نے میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی دو فہرستوں میں سے ایک بھی نہ پائی۔ اگر جواب نفی میں ہے۔ تو ایک طرف تو ان خطوں کی گمشدگی پر مجھے افسوس ہوگا۔ دوئم یہ کہ اس فہرست کی نقل میں نے موجود ہی نہیں رکھی ہے۔ مجھے تو پھر کئی دن اور سوچنا پڑے گا اور مختلف اطراف سے مشورہ لینا ہوگا۔

۲۔ حلیمہ[2] کے متعلق میرا یہی فیصلہ ہے۔ کہ فی الحال وہ ''ماہر کی تعلیم جاری رکھے۔ اگر خدا نہ کرے میں امتحان شروع ہونے تک حاجن پہنچ نہ سکا تو ۱۶ جولائی سے ہی وہ ''کامل'' کی تیاری کرے۔

---

[1] اس وقت کے ڈپٹی رجسٹرار کشمیر یونیورسٹی

[2] حلیمہ پروفیسر حاجنی کی دختر

۳۔ چونچہ بردار صاحب[1] کیا اپنے پیشترو کے نقش قدم پر چلتے چلتے سبک رفتار بنا ہے یا انسانوں ہی کی طرح چلتا ہے۔

۴۔ امین[2] کے گرم مطالعے کے متعلق آپکے سوا کوئی تعریف نہیں لکھتا۔ لیکن عزیزی عبدالرحمان[3] کے بارے میں جو غفلت آپنے اور دیگر اساتذہ نے برتی ہے۔ وہ مذمت کی مستحق ہے۔ صفائی سننے کی ضرورت نہیں۔

آپ کا بھائی

محی الدین حاجنی''

پروفیسر حاجنی صاحب کے ان خطوط سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ظریفانہ اندازِ اظہار پر قدرت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں حاجنؔی کے خطوط سے حکومتِ وقت کے ساتھ اُن کی تلخیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ جہاں وہ اپنے بھائی کو ''چونچہ برادر'' کہتے ہیں۔ وہی ''ریڈیو کشمیر چونکہ کفر اور فسق کے بدبو سے گرا ہوا ہے'' یا ''ڈوگرہ سیکریٹری کے ساتھ کسی قوم فروش بہی خواہ کے ذریعے رابطہ کیا جائے'' جیسے جملے قابل غور ہیں۔

حاجنی صاحب کے متذکرہ بالا خطوط میں ''جو بر پرور، زنانہ آمیزش، فسق، بدبو، اندرا کے لے پالک، دودنما، نیم گنجا، سودمرکب، کبک رفتار جیسے مخصوص الفاظ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

۱۔ غلام حسن پرے حاجنؔی صاحب کے چچازاد بھائی

۲۔ محمد امین پرے حاجنؔی صاحب کے اکلوتے فرزند

۳۔ عبدالرحمان حاجنؔی صاحب کے ایک اور چچازاد بھائی

ان الفاظ کو وہ اکثر و بیشتر اور عام طور پر اپنی تحریروں میں استعمال کرتے تھے۔ ان ہی الفاظ کی بناء پر اُن کا اندازِ تحریر منفرد اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسی اسلوب کا نام ''حاجنیت'' ہے۔

جیسے کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ پروفیسر حاجنیؔ صاحب نے صرف اُردو اور کشمیری میں ہی اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو خط نہیں لکھے، بلکہ عربی اور انگریزی میں بھی ایسے گراں قدر اور پر مغز خطوط لکھے ہیں جو اُن کے عالِم ہونے کی سند پیش کرتے ہیں۔ لیکن ایسے خطوط کو موضوع کی مناسبت سے اس کتاب میں شامل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

امید یہ کی جا سکتی ہے کہ پروفیسر حاجنیؔ کے عزیز واقارب اور کشمیری لسانی تحریک سے وابستہ لوگ ان خطوط کو جمع کرنے کی مہم شروع کریں گے۔ اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ اس قسم کے قدم سے کشمیری زبان وادب کی لسانی تحریک کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ حاجنیؔ صاحب کی ایک نئی توضیح سامنے آئے گی۔

جو ہم سمجھے

پروفیسر محی الدین حاجنی کی حیات اور اُن کے ادبی کارناموں پر لکھا گیا یہ مقالہ اب لگ بھگ مکمل ہو چکا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ مقالے میں عام اور رائج زبان استعمال ہو۔ پورے مقالے میں ضرور ایسی باتیں ہوں گی۔ جنہوں نے آپ کے دل کو چھوا ہوگا۔ کئی بار آپ کے نظریات کے ساتھ تضاد بھی ہوا ہوگا۔ میں اب اُن چند باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا، جن باتوں کو میں تفہیمِ حاجنی کے سلسلے میں خاص اور اہم محسوس کرتا ہوں۔ یہ اہم نکات درجِ ذیل ہیں :

☆ پروفیسر حاجنی ایک ان پڑھ اور زمیندار گھرانے میں پیدا ہوکر علم و ادب کی معراج تک پہنچ گئے۔

☆ پروفیسر حاجنی بہت ہی حساس اور حاضر جواب انسان تھے۔ اس حساسیت نے اُن کے مزاج کو لااُبالی بنایا تھا۔

☆ حاجنی صاحب ایک سچے مسلمان اور معتقد تھے۔ اس لئے وہ فضول چیزوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن مہمان کی آمد پر گھر میں عید مناتے تھے۔

☆ پروفیسر حاجنی صاحب ایک ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ علی گڑھ میں ایک ساتھ کئی ڈگریاں حاصل کر کے اور پھر یونیورسٹی کے لٹن کتب خانے سے کتاب الطّواسین کو زبانی یاد کرنے کے بعد نقل کر کے انہوں نے یہ بات ثابت کر دی۔ انہیں علم حاصل کرنے کا انتہائی حد تک شوق تھا۔

☆ حاجنیؔ صاحب نے عربی زبان کی صوفیانہ شاہکار ''کتاب الطّواسین'' کی اُردو میں تشریح کر کے اردو زبان کے دامن کو وسعت بخشی۔

☆ حاجنیؔ صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کشمیری زبان و ادب کے دلدادوں کے سامنے کشمیری شعراء اور ادیبوں کی زندگی اور کارناموں پر قلم اٹھا کر اردو زبان میں پیش کیا۔ اور ہندوستان کے اُردو داں طبقے کے سامنے کشمیری شعراء اور ادیبوں کے کارناموں کو پیش کیا۔ اسطرح انہوں نے کشمیری اور اُردو کے درمیان حائل دیواروں کو مٹا کر انہیں بغل گیر کر دیا اور دونوں زبانوں کی نا قابل فراموش خدمت کی۔

☆ موضوع کوئی بھی ہو، لیکن پروفیسر حاجنیؔ کے مضمون میں کشمیریوں کا درد وکرب رقص کناں نظر آتا ہے۔ وہ کشمیریوں کی بار بار کی خرید وفروخت کا ذکر کئے بغیر رہ ہی نہیں پاتے ہیں۔ حاجنیؔ صاحب بے حال، غریب اور لاچار کشمیریوں کے بہت بڑے غم گسار تھے۔

☆ حاجنیؔ صاحب نے کشمیر میں اردو میں پچاس کے عشرے میں انشائیے لکھے۔ حالانکہ اُن کے بعد اس صنف میں بہت کم پیش رفت ہوئی۔ حاجنیؔ صاحب کے انشائیے طنز ومزاح سے لبریز، مودبانہ ظرافت کی عکاسی کرتے ہیں۔

☆ حاجنی صاحب ایک ٹھوس صحافی ہونے کے علاوہ ایک منفرد ادب نواز پروفیسر تھے۔ وہ صرف رومانی ادب اور ادبی نعرہ بازی کے قائل نہ ہونے کے علاوہ عروض واوزان سے چھٹکارہ پانے والوں سے بھی بیزار تھے۔ وہ کئی رسائل کے ساتھ وقتاً فوقتاً وابستہ رہے۔

☆ حاجنیؔ صاحب بہت اچھے مکتوبات نگار بھی تھے۔ اُن کے مکتوبات میں دنیا جہاں کی باتیں بیان ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی یہاں کے مختلف سرکاری اور نیم

سرکاری یا غیر سرکاری اداروں کے تیئں اُن کا وطیرہ بھی سامنے آتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے خط مختلف شخصیات کو پردوں سے نکال کر بے پردہ بھی کرتے ہیں۔

☆ حاجنیؔ صاحب نے اپنی تخلیقات میں ایک خاص اور منفرد اندازِ بیان کا استعمال کیا ہے۔ اندازِ بیان کی انفرادیت کی بناء پر ہی ڈاکٹر مشعل سلطانپوری نے اُن کے اسلوب کو ''حاجنیت'' کا نام دیا ہے۔ یہ اسلوب حاجنیؔ صاحب کی تقریباً سبھی تخلیقات میں استعمال ہوا ہے۔

☆ جموں و کشمیر کی سیاست سے پروفیسر حاجنیؔ صاحب کوسوں دور رہتے تھے۔ وہ یہاں کی سیاست اور سیاست دانوں سے بیزار رہا کرتے تھے۔ اس کا خمیازہ انہیں دو بار جیل جا کر بھگتنا پڑا۔

☆ پروفیسر حاجنیؔ صاحب آفتاب نہیں، بلکہ اندھیری رات میں ایک چمکتا ہوا چاند تھے اور چاند پر داغ اُسکی بدصورتی میں نہیں، بلکہ خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ حاجنیؔ صاحب گالیاں دینے میں بے مقابل تھے۔ اپنا نقطۂ نظر منوانے میں انتہا پسندی کا مظاہرہ کرنا، اُن کے دوستوں کو کھٹکتا تھا۔ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں تاش کھیل کر وقت گذاری کرتے تھے۔ علاوہ ازیں صحت کے متعلق لاپرواہی اور تمبا کو حد سے زیادہ پینا اُن کے عاداتِ یکتا تھے۔

☆ حاجنیؔ صاحب عربی کے عالم اور اُستاد تھے۔ لیکن اُن کی گرفت فزیکس (Physics)، کمسٹری (Chemistry)، علم بناتات و جمادات (Life Science)، تاریخ (History)، سیاسیات (Pol. Science) جغرافیہ، انگریزی، اردو اور فارسی کے علاوہ ریاضیات (Mathematics) پر بھی تھی۔

☆ حاجنیؔ صاحب ایک خلوص منداور دیانت دار اُستاد تھے۔ انہوں نے ہمیشہ

اپنے پیشہ کو فرض سمجھ کر اس کے ساتھ انصاف کیا۔

میں اس کتاب کو اتنی طوالت نہیں دینا چاہتا تھا، لیکن شاید عقیدتاً یا کسی حق ادائی کی خاطر میں اپنے مقررہ احاطے سے باہر نکل گیا۔ اب مزید طوالت کو کھینچتے ہوئے، وقت اور فرصت کے لمحات کو بچا کر اس کتاب کا اختتام حاجنؔی صاحب کے ایک قریبی دوست کے ان حقیقت پسند جملوں سے کرتا ہوں۔ جو انہوں نے حاجنؔی صاحب کے رحمت حق ہونے سے تقریباً نصف صدی قبل قلمبند کئے تھے۔ یہ کچھ جملے پڑھ کر پڑھنے والوں کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ جہلم کے کنارے، حاجن کے پرے خاندان کا کون سا اور کیسا فرزند ارجمند آرام فرما ہیں۔ یہ چند جملے اُن کی عظمت کی ایک ایسی دستاویز ہے جو ہمیشہ جاوید رہے گی۔ اور وقتی بغاوتوں اور تفاوتوں کے دھارے اس کو کبھی بھی مغلوب نہ کر سکیں گے۔

"ہمارے یہ لاا اُبالی دوست نہ مولوی ہیں نہ مفتی۔ نہ معلمِ اخلاق ہیں نہ لیڈر۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں قل اعوذیت کے شدید مخالف۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ انگریزی، عربی، فارسی اور اُردو ادب پر گہری نظر رکھنے کے علاوہ وہ دورِ حاضر کے سائنسی علوم میں بھی بدطولیٰ رکھتے ہیں۔ وہ انشاء پرداز بھی ہیں اور نقاد بھی۔ تاریخ، جغرافیہ، لسانیات، دینیات، عمرانیات، ریاضی، طبیعات، ہیت۔ آپ جس موضوع پر اُس سے گفتگو کرنا چاہیں وہ اس موضوع کے ایک ایک پہلو پر اس طرح بحث کریں گے کہ آپ اُن کی ہمہ دانی کے قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک بات ضرور ہے اپنے نقطۂ نظر کو منوانے کے لحاظ سے وہ ہمیشہ سے انتہا پسند واقع ہوئے ہیں۔ طرز استدلال کا دِل نشین انوکھا پن اُن کی گفتگو کا طرہ امتیاز ہے۔ وہ ہر قسم کے مباحث میں ایک نرالی جدت پیدا کرنے کے قائل ہیں۔"[1]

---

[1] گلاب اور گل قند ماخوذ از یادوں کے آنسو غ۔م۔طاؤس

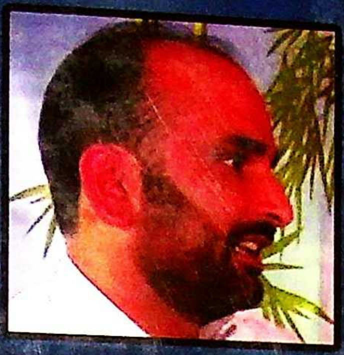
کتابیات

نمبر	نام کتاب	مصنف/مرتب/مُدیر	سال اشاعت	پبلشر
۱	شیرازہ حاجنی نمبر	اختر بشیر	۱۹۹۳ء	جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز
۲	حرفِ خوب	انصاری نشاط	۱۹۹۶ء	نشاط پبلکیشنز دلنہ
۳	محی الدین حاجنی ہندوستانی ادبکی معمار	انصاری نشاط	۱۹۹۶ء	ساہتیہ اکادمی، دہلی
۴	بازیافت	آزردہ محمد زماں (مدیر اعلیٰ) مضمر مجید (مدیر)	۱۹۹۲	شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی
۵	جموں و کشمیر میں اردو ادب کا نشو ونما	پریمی ڈاکٹر برج	۲۰۰۰ء	
۶	ودلرکی ملر حاجنی نمبر	حاجنی عزیز تسکین غلام حسن نیاز ثناء اللہ	۱۹۹۸ء	حلقہ ادب سوناواری حاجن
۷	پرتاب (فائیل)	حاجنی محی الدین (نگران)	۵۴-۱۹۵۳ء	سری پرتاب کالج سرینگر
۸	دیوانِ وہاب	حاجنی محی الدین		جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچرل اینڈ لنگویجز

۹	کلیاتِ اسد پرے	حاجنی محی الدین	۱۹۹۶ء	جموں وکشمیر اکیڈمی آف آف آرٹ، کلچرل اینڈ لنگویجز
۱۰	گلریز (فائیل)	حاجنی محی الدین عبدالحق برق	اپریل ۱۹۵۳ء تا اگست ۱۹۵۳ء	بزم ادب کشمیر
۱۱	گلریز (فائیل) ماہنامہ	حاجنی محی الدین	اگست ۱۹۵۳ء تا اپریل ۱۹۵۵ء	بزم ادب کشمیر
۱۲	کأشر شأیری	حاجنی محی الدین	۱۹۶۰ء	ساہتیہ اکادمی، دہلی
۱۳	کوشر نثر	رہبر اوتار کرشن خیاؔل غلام نبی	۱۹۶۷ء	جموں وکشمیر کلچرل اکادمی
۱۴	وہاب پرے ہندوستانی ادب کے معمار	ساقی موتی لال	۱۹۹۶ء	ساہتیہ اکادمی، علی
۱۵	پژو (حاجنی نمبر)	سلطانپوری ڈاکٹر مشعل انصاری نشاط احسن محمد احسن	۱۹۹۶ء	ادبی مرکز کمراز سوپور

۱۶	کشمیر میں اُردو جلد ۳	سروریؔ عبدالقادر	۱۹۸۴ء	جموں و کشمیر اکیڈمی آف آف آرٹ، کلچرل اینڈ لنگویجز
۱۷	کأشرِ ادبُک توأریخ	شوق شفیع منور ناجی	۱۹۹۲ء	شعبہ کشمیری کشمیر یونیورسٹی حضرتبل سرینگر
۱۸	ہفتہ وار آئینہ سالنامہ (شخصیات نمبر)	شمیمؔ احمد شمیمؔ	۱۹۶۹ء	
۱۹	یادوں کے آنسو	طاؤس غلام محمد	۱۹۸۵ء	
۲۰	گلریز فائل ماہنامہ	کاملؔ محمد امین	نومبر ۱۹۵۲ء تا مارچ ۱۹۵۳ء	بزم ادب کشمیر سرینگر
۲۱	ہمارا ادب (لوک ادب نمبر)	نازکیؔ رشید	۷۶-۱۹۷۵ء	جموں و کشمیر کلچرل اکادمی
۲۲	محفل اقبال	نازکیؔ رشید	۱۹۷۸ء	جموں و کشمیر کلچرل اکادمی

کچھ مصنف کے بارے میں



نام: محمد شفیع وانی

قلمی نام: شاکر شفیع

ولدیت: محمد یوسف وانی

سکونت: وارڈ نمبر ۳ بونی کھن حاجن بانڈی پورہ کشمیر

تعلیم: ایم۔اے اردو (گولڈ میڈلسٹ) T, SLET

پیشہ: لیکچرر محکمہ اسکولی تعلیم جموں وکشمیر

رکنیت: جنرل سکریٹری حلقہ ادب سوناواری

ممبرِ عاملہ ادبی مرکز کمراز جموں وکشمیر

مہتمم دارالعلوم اسلامیہ حاجن

ممبر نصابی مشاورتی کمیٹی جموں کشمیر اسٹیٹ بورڈ

مستقل مشاورتی ممبر اسٹیٹ انسٹیچوٹ آف ایجوکیشن کشم

تصنیف: سرمایہ دین (۲۰۰۶)

973-93-30691-44-2

Meezan Publishers & Distributors

Opp. Fire & Emergency Services HQRS Batamaloo

Srinagar Kashmir-190009

Ph/Fax:- 0194-2457215 | Cell: 9419002212 | 8494002212 | 7006773403

E-Mail: meezanpublishers@gmail.com | @rediffmail.com